معاشرتی جمہوریت

اپنے مستقبل کی تشکیل میں مضبوط عوامی کردار کے مواقع کی تلاش

مصنف

ڈیوڈ میتھیوز

ترتیب و تدوین

نعمان تسلیم خان

مترجم

علی زین

جملہ حقوق محفوظ بحق کیٹرنگ فاؤنڈیشن

نام کتاب	:	معاشرتی جمہوریت
ترتیب وتدوین	:	نعمان تسلیم خان
مترجم	:	علی زین
پروف ریڈنگ	:	عثمان تنویر
سال اشاعت	:	2016ء
قیمت	:	-/750روپے،15امریکی ڈالر

فہرست

نمبر شمار	تفصیل	صفحہ نمبر
تعارف	نعمان تسلیم خان	5
	پہلا حصہ: جمہوریت کیا ہے؟	
باب اول	جمہوری نظام کے مسائل	10
باب دوم	ایسی جمہوریت کے قیام کی کوشش جس کا محور عوام ہوں	14
باب سوم	سیاسی ماحول	28
	دوسرا حصہ: شہری اور معاشرہ	
باب چہارم	کیا واقعی عام لوگ حکمرانی کر سکتے ہیں؟	44
باب پنجم	عوام کو حکمرانی واپس دینا	52
باب ششم	شہری: جو علم رکھتے ہوں اور کاموں میں حصہ دار بنیں	64
باب ہفتم	عوامی بحث اور عوامی فیصلہ سازی	72
باب ہشتم	مباحثوں کو پروان چڑھانے کیلئے مسائل کو پیش کرنا	82
باب نہم	معاشرے میں موجود مواقع	88
باب دہم	جمہوری روایات	108
	تیسرا حصہ: ادارے، ماہرین اور عوام	
باب گیارہ	اختلاجات کی خلیج کو پر کرنا	118
باب بارہ	معاشرے کی اصلاح کیلئے تجربات اور ان کیلئے دستیاب مواقع	130
اختتامیہ	ڈیوڈ میتھیوز	155

تعارف

یہ کتاب ان افراد کیلئے لکھی گئی ہے جو ابراہم لنکن کے قول 'جمہوریت ایک ایسا نظام حکومت ہے جس میں عوام بیک وقت حکمران اور رعایا ہوتے ہیں اور اس کا مقصد بھی عوام کی منشا کو پورا کرنا ہوتا ہے' کے تحت مصمم یقین رکھتے ہیں کہ جمہوری نظام میں طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں۔عوام ہی اپنے معاشرے میں بہتری لا سکتے ہیں اور اگر کوئی معاشرتی گراوٹ سر اٹھائے گی تو بھی اس کے ذمہ دار عوام ہی ہوں گے۔ڈیوڈ میتھیوز نے یہ کتاب ایسے ہی چندلوگوں کی داستان کی بنیاد پر تحریر کی ہے تاکہ اکیسویں صدی میں جبکہ منتخب جمہوری حکومتوں کی ناکامیاں جمہوری نظام پر عوامی عدم اعتماد کا باعث بن رہی ہیں،عوام کو ایسی راہیں دکھائی جائیں جہاں عوام ایک بار پھر اپنے مستقبل سے متعلق جڑے ہوئے معاملات پر زیادہ بااختیار ہوں۔ہم نے ان کے اسی خیال کو'معاشرتی جمہوریت' کا نام دیا ہے۔

کئی لوگ پہلے ہی سے ایک ایسے جمہوری نظام کے تحت زندگیاں گزار رہے ہیں جس کا منتخب جمہوری حکومتوں سے انتہائی کم واسطہ ہے اور اس کی بجائے ان کا براہ راست تعلق عوام سے ہے۔ایسے عوام جو اپنے معاشرے کو رہنے کیلئے بہترین جگہ بنانے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔روتھ،جین،میکس،سوا اور سینڈی ایسے ہی معمولی زندگیاں گزارنے والے شہری ہیں جو غیر معمولی کاموں میں شامل ہیں اور صحیح معنوں میں اپنے ملک کیلئے سرمایہ افتخار ثابت ہو رہے ہیں۔

ان میں سے ہر کسی کی داستان میں کچھ قدریں مشترک ہیں وہ یہ کہ ان سب سے اپنے معاشرے میں موجود مسائل کو ایک الگ زاویہ نگاہ سے دیکھا۔جس میں ان مسائل کا حل کسی سرکاری ادارے کی ذمہ داری نہیں بلکہ یہ کام عوام کے فرائض میں شامل تھا۔اس کے علاوہ انہوں نے ان مقامی الجھنوں سے نمٹنے کیلئے کوئی انتہائی تکنیکی یا مہنگے حل بھی تجویز نہیں کئے بلکہ مقامی لوگوں کے پاس پہلے ہی دستیاب وسائل کو بروئے کار لا کر ان مسائل سے نبرد آزما ہوئے۔سب سے اہم امر یہ ہے کہ انہوں نے اپنے ان کاموں میں عوام کو شامل کیا اور ان میں یہ احساس پیدا کیا کہ جس قدر لگن کے ساتھ وہ اپنے مسائل خود حل کریں گے وہ اسی قدر طاقتور ہوتے جائیں گے۔یوں صحیح معنوں میں ایک ایسا جمہوری معاشرہ ترتیب پا سکتا ہے جس میں تمام اختیارات عوام کی مرہون منت ہوں۔

گو کہ کتاب میں بیان کئے جانے والے تمام ہی حقائق امریکی نظام حکومت اور معاشرتی نظام کے پس منظر کے ساتھ تحریر کئے گئے ہیں مگر معاشرتی جمہوریت کا نظام پاکستان جیسے ترقی پذیر ممالک کیلئے اس سے بھی کہیں

زیادہ ضروری ہے۔ کیونکہ اپنی تخلیق کے چھ دہائیاں گزرنے کے بعد بھی پاکستان آج تاریخ کے اس چوراہے پر کھڑا ہے جہاں عام آدمی کو جمہوری نظام اپنی ہی طرح بے بس اور بے وقعت نظر آتا ہے۔ اس کی وجہ چاہے کمزور جمہوری اقدار اور منتخب حکومتوں کی نااہلی ہو یا بار بار لڑکھڑاتی کرپشن زدہ سیاسی قیادت ہو، ایک بات طے ہے کہ پاکستان کی بقا کی ضمانت صرف اور صرف اس کے عوام ہیں۔

پاکستان کی منتخب حکومتوں کی پے در پے ناکامیوں اور عوام کی ٹوٹتی ڈھارس کے اس ماحول میں ضروری ہے کہ شہریوں کے سامنے ایسے نکات کی نشاندہی کی جائے جہاں وہ انتہائی معمولی کردار ادا کر کے معاشرے میں انقلاب برپا کر سکتے ہیں۔ انتخابی جمہوری نظام پر اظہار عدم اعتماد کی بجائے وہ اپنے معاشرے میں ایک ایسا جمہوری نظام قائم کر سکتے ہیں۔ ایسا معاشرتی جمہوری نظام جس میں مسائل، اختیارات اور حل براہ راست انہی سے جڑے ہوں اور کوئی بھی مثبت تبدیلی لانے کیلئے نہ تو کسی رہنما کی ضرورت ہو اور نہ ہی انہیں حکومتی وسائل درکار ہوں۔ یقیناً ہر مسئلے کا تدارک ہمارے آس پاس ہی موجود ہے لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ عوام مسائل اور معاشرے کو ایک نئی نظر سے دیکھیں۔ یہ کتاب عوام کو ایک ایسا ہی نقطہ نظر فراہم کرنے کی ایک کاوش ہے۔

نعمان تسلیم خان

☆☆☆☆

باب اول

جمہوریت کیا ہے؟

جمہوری نظام کے مسائل

میرے خیال میں جمہوریت کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اس نظام میں شہری عملی طور پر شریک ہونے کی بجائے محض تماشائیوں کی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں۔ عام لوگ روایتی انتخابی جمہوری عمل کا حصہ بننے سے متعلق تذبذب کا شکار تو ہوتے ہی ہیں مگر کئی دفعہ یہ دوسرے شہریوں کے ساتھ مل کر سماجی بھلائی کے کاموں میں شریک ہونے سے بھی کتراتے ہیں۔ انتخابات میں کم لوگوں کی طرف سے حق رائے دہی استعمال اس کی واضح مثال ہے۔ اسی طرح کئی سماجی فلاح کے کام بھی اس وجہ سے ناکام ہو جاتے ہیں کہ لوگ اس میں اپنا حصہ ڈالنے کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے عام لوگوں کو اس سے کوئی فرق ہی نہیں پڑتا یا پھر وہ اس بات سے آگاہ نہیں ہوتے کہ ان کاموں کا مقصد انہی کی بہتری ہے۔ اس کی ممکنہ وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ عام لوگ ایسے منصوبوں کے نتائج سے غیر متعلقہ رہ کر بھی گزارہ کر سکتے ہیں یا پھر خود اس نظام نے ہی انہیں نظر انداز کر کے اس بات پر یقین کر لینے پر مجبور کر دیا ہے کہ ان کا حق رائے دہی استعمال کرنا ایک فضول امر ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایسے لوگ بری طرح مایوسی کا شکار ہو چکے ہوں۔ اس معاملے کی وجہ کچھ بھی ہو یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ شہریوں کی اس نظام میں عدم شمولیت جمہوریت کے مسائل میں سے ایک ہے۔

جمہوریت میں سیاست ہر شہری کا جز وقتی پیشہ ہونا چاہئے: ڈوائٹ ڈی آئزن ہاور

دوسرا مسئلہ بھی اس سے جڑا ہوا ہی ہے۔ وہ یہ ہے کہ جمہوری نظام میں معاملات پر بحث اس انداز میں کی جاتی ہے جو معاشرے میں تقسیم کا باعث بنتا ہے۔ کئی مرتبہ کسی مسئلہ سے نبرد آزما ہونے کے لئے دستیاب تمام مواقعوں پر غور ہی نہیں کیا جاتا اور صرف دو ایسے راستوں کا ہی انتخاب کیا جاتا ہے جو بالکل ایک دوسرے کے مخالف سمت میں جا رہے ہوتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے معاشرے میں منفی بحث کا آغاز ہو جاتا ہے۔ اس دوران مختلف آراء کے مابین توازن کو بھی برقرار نہیں رکھا جاتا اور اختلاف پیدا ہونے کا خدشہ غیر ضروری بحث کی صورت میں سامنے آتا ہے۔

جمہوریت کے سبب پیدا ہونے والا تیسرا بڑا مسئلہ یہ ہے کہ لوگوں معلوم نہیں ہوتا کہ ان کے لئے کیا بہتر ہے۔ لوگ شاید جمہوری عمل کا حصہ تو بن جائیں مگر جب بھی کبھی انہیں یہ فیصلہ کرنا پڑے کی کونسی پالیسی ان کے حق میں بہتر ہے تو وہ ایسی صورتحال میں کچھ فیصلہ نہیں کر پاتے اور یوں غلط معلومات اور جذباتی وابستگی پر مبنی جلدی بازی میں فیصلے کر لئے جاتے ہیں۔ بعض اوقات ایسے فیصلے کرنے میں بھی مشکلات پیش آتی ہیں جن کا تعلق براہ راست اخلاقیات سے ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر صحت سے متعلقہ سامان کی تقسیم کے دوران صحیح اور انصاف پر مبنی فیصلے کرتے ہوئے سنجیدہ نوعیت کی صورتحال پیدا ہوسکتی ہے۔ ایسے حالات سے نمٹنے کیلئے اعلیٰ سطح کی فیصلہ سازی کی صلاحیت ہونا ضروری ہوتی ہے۔

چوتھا مسئلہ یہ ہے کہ جمہوریت کی موجودگی میں عام طور پر شہری میں پایا جانا والا یہ تاثر ہے کہ ان کی موجودگی سے سیاسی نظام میں کوئی فرق نہیں پڑے گا کیونکہ ان کے پاس مطلوبہ وسائل موجود نہیں ہیں۔ حالانکہ کچھ مسائل ایسی نوعیت کے ہوتے ہیں کہ شہریوں کی تعاون کے بغیر ان کا حل ممکن نہیں ہوتا۔ مثلاً عام لوگوں کی شمولیت کے بغیر نوجوانوں کو منفی سرگرمیوں سے باز رکھنے جیسے پروگراموں پر عمل کرنا انتہائی مشکل کا ہوسکتا ہے۔ اسی طرح سکولوں اور سماجی خدمات کے اداروں کی موجودگی تو بہرحال ضروری ہے مگر شہریوں کی عدم شمولیت کی صورت ان سے مطلوبہ فوائد حاصل نہیں کئے جاسکتے۔

باہمی عدم تعاون کی صورت میں ایک اور بڑا مسئلہ بھی جمہوری نظام میں ظاہر ہوتا ہے۔ شہری اس نظام کا حصہ بن کر اسے کامیاب بنانے کیلئے اپنی توانائیاں تو صرف کرتے ہیں مگر ان کی سمت مختلف ہوتی ہے اور یوں ایک دوسرے کی مدد نہ کرنے کے سبب یہ تمام رائیگاں جانے کا خدشہ ہوتا ہے۔ ایسی صورتحال سے نمٹنے کا آسان ترین حل ایک ایسی طاقت کے قیام کی صورت میں ہوسکتا ہے جو شہریوں کی خدمات سے متعلق ضابطے تشکیل دیکر باہمی تعاون کی کمی کو پورا کردے۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی بھی قدرتی آفت کے فوراً بعد عام شہریوں کی ازخود امدادی سرگرمیوں اور ایک باقاعدہ ادارے کے پیشہ ورانہ کام میں واضح فرق ہوتا ہے۔ دوسری جانب باہمی تعاون کی عدم موجودگی کی طرح بیوروکریسی کو زیادہ طاقتور بنا کر عام شہریوں پر حاوی کردینا بھی جمہوری نظام میں خرابی کا باعث بنتا ہے۔

جمہوریت کو جہاں ایک طرف ہر وقت بدلتے ہوئے حالات کا سامنا کرنا ہوتا ہے وہیں اس نظام کو کبھی نہ ختم ہونے والے کچھ مسائل بھی درپیش ہوتے ہیں۔ دراصل جمہوریت کے سبب پیش آنے والے مسائل بھی ازلی ہی ہیں کیونکہ ان کا براہ راست تعلق انسانی حالات سے ہے۔ بطور انسان ہم کسی بھی وقت راہ راست سے ہٹ سکتے ہیں اور کچھ غلط توقعات کے باعث غلط فیصلے کرسکتے ہیں۔ اسی طرح صرف جمہوری نظام کا قیام ہی منزل نہیں بلکہ یہ ایک ایسا راستہ ہے جس پر سفر کرتے ہوئے ہمیں ہر وقت سیکھنے کا موقع ملتا رہتا ہے اور اس ضمن میں مسلسل اور اجتماعی

کوششیں مطلوب ہوتی ہیں۔ بصورت دیگر جمہوریت صحیح طور پر کام نہیں کرسکتی اور یہی اس نظام کا چھٹا مسئلہ ہے۔

اس سلسلے میں آخری خرابی باہمی تعاون کی فضا کی کمی ہے جو کہ ایک بہت پرانی مصیبت کی صورت میں ابھی تک موجود ہے۔ باہمی تعاون کے بغیر نہ تو شہریوں کے آپس کے تعلقات درست سمت میں آگے بڑھ سکتے ہیں اور نہ ہی حکومتی یا غیر حکومتی اداروں میں کام ہوسکتا ہے۔ جمہوری نظام میں ادارے یہ خیال کرتے ہیں کہ شہری ذمہ دار اور اہلیت کے حامل ہیں جبکہ لوگوں میں تاثر ہوتا ہے کہ ادارے غیر موثر اور لاتعلق ہیں۔

جمہوری سیاست عملی ہونے کے ساتھ ساتھ تخلیقی عمل بھی ہے۔ لوگ جس معاشرے اور دنیا میں رہتے ہیں اسے بہتر بنانے کے قابل ہونا چاہتے ہیں تاکہ وہ اپنے لئے بہتر مستقبل ترتیب دے سکیں۔

☆☆☆☆

باب دوم

ایسی جمہوریت کے قیام کی کوشش جس کا محور عوام ہو

جمہوری نظام میں پیدا ہونے والے مسائل کی وجوہات کا جاننا عوام کی شمولیت کے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔ مگر یہ ایک غیر واضح امر ہے کہ شہری اس نظام میں کیا کردار ادا کریں گے؟ کیا لوگوں کا ووٹ ڈالنا، ٹیکس دینا اور سماجی امور میں شامل ہونا ہی کافی ہے؟ یا انہیں کوئی اور کردار بھی ادا کرنا ہوگا؟ شاید اس کا تعلق ہمارے ذہن میں موجود جمہوریت کے نقشے سے ہے۔

ہم یہاں جمہوریت کے جس نظریے پر بحث کر رہے ہیں اس کا تعلق جمہوریت کے لفظی مطلب سے ہی ہے۔ انگریزی زبان میں جمہوریت کیلئے متبادل لفظ 'ڈیموکریسی' ہے جو دراصل دو الفاظ 'ڈیمو' اور 'کریسی' کا مجموعہ ہے۔ مزید یہ کہ لفظ 'ڈیمو' ڈیموس سے ماخوذ ہے جس کا مطلب شہریت ہے جبکہ لفظ 'کریسی' کریٹوس سے نکلا ہے جس کے معنی حکمرانی کے ہیں۔ یوں جمہوریت سے مراد وہ نظام ہے جس میں شہری اپنے مستقبل کو بہتر بنانے کیلئے خود ہی حق حکمرانی استعمال میں لاتے ہیں۔ بہرحال اس نظام کا محور عوام ہی ہوتے ہیں حالانکہ انہیں اس نظام کا حصہ بنانے کیلئے ہر مرحلے پر کئی کوششیں درکار ہوتی ہیں۔

روایتی طور پر جمہوریت سے مراد ایک ایسا نظام لیا جاتا ہے جس میں ایک انتخابی عمل کے ذریعے عوامی نمائندوں پر مشتمل حکومت قائم کی جاتی ہے۔ تاہم میرا خیال ہے کہ ایک نمائندہ حکومت کی موجودگی کے علاوہ کچھ ایسے لوگ جو محض ووٹ ڈالنے سے بڑھ کر کردار ادا کرتے ہیں، بھی جمہوری نظام کیلئے ایک اہم ستون کا کام کرتے ہیں۔ اس نظام کے تحت نمائندہ اداروں کو کام کرنے میں شہریوں کی مدد کی بالکل اسی طرح ضرورت ہوتی ہے جس طرح عام مسائل کے حل کیلئے عام لوگ آپس میں مل جل کر کام کرتے ہیں۔ گویا ایک کامیاب اور دیرپا جمہوری نظام کا قیام صرف اسی صورت ممکن ہے جب عام لوگ بھی مکمل طور پر اس کا حصہ بن جائیں۔

بعض قومی رہنما ایسے جمہوری نظام میں عوام کی شمولیت کی حوصلہ شکنی کرتے رہے اور واشگاف الفاظ میں جمہوریت کے تحت صرف ایک نمائندہ حکومت ہی قائم کرنے تک محدود رہنا چاہتے رہے۔ ان کا خیال تھا کہ عام لوگوں خاص طور پر غرباء کے ہاتھوں میں طاقت دیئے جانے سے معاشرے میں دولت کی تقسیم نو کا آغاز ہوسکتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے برطانیہ کے نوآبادیاتی نظام کے تحت بعض قصبوں میں لوگوں کے ہاتھوں میں طاقت آتی

گئی اور نتیجتاً انہوں نے شہریوں پر مشتمل افواج تشکیل دیں اور اس کا انجام انقلاب کی صورت میں سامنے آیا۔ یہ عمل اٹھارہویں صدی کے اختتام تک جاری رہا اور انیسویں کے آغاز میں عام لوگوں نے سرحدوں پر علاقے قائم کئے۔ یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے گرجا گھر تعمیر کئے، سکول اور سڑکیں بنائیں اور لائبریریاں قائم کیں۔ اس دوران ان لوگوں نے حلیف علاقوں سے مل کر باہمی تعاون کیلئے تنظیم سازی اور مصیبت کے وقت میں ہمسایہ علاقوں کی مدد کرنے کا نظام وضع کیا۔ یہی وہ لوگ تھے وہ اپنا بیشتر وقت ایسے کاموں میں صرف کر دیتے تھے جس کا فائدہ تمام افراد کو یکساں طور پر ہوتا تھا۔

عوامی حمایت کی موجودگی میں کوئی منصوبہ ناکام نہیں ہوتا، اور اس کی عدم موجودگی میں کوئی تدبیر کارگر ثابت نہیں ہوسکتی: ابراہام لنکن

انہی لوگوں سے متعلق مشہور فرانسیسی مبصر الیکسز ڈی ٹا کیولے کا کہنا ہے کہ اگر امریکیوں کو کوئی مسئلہ درپیش ہو تو وہ یورپی شہریوں کی طرح حکومت سے مدد لینے کی بجائے اپنے ہمسائے سے رجوع کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ تاہم موجودہ جمہوری نظام میں امریکی شہری نہ صرف اپنے کردار سے متعلق پریشانی کا شکار ہیں بلکہ انہیں ان اداروں سے متعلق بھی کئی خدشات لاحق ہیں جو دراصل انہوں نے اپنی بہتری کیلئے ہی قائم کئے تھے۔

دو طرفہ عدم اعتماد

امریکی شہری یہ جانتے ہیں کہ موجودہ جمہوری نظام میں کچھ خامیاں ہیں اور ہم اس ضمن میں بھی پریشان ہیں کہ ہمارے ملک کا مستقبل کیا ہے۔ سال 2011 میں کئے گئے ایک سروے میں یہ بات سامنے آئی کہ نصف سے زیادہ امریکی یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے ملک کے اچھے دن پہلے ہی گزر چکے ہیں جبکہ صرف 17 فیصد کا خیال تھا کہ امریکہ درست سمت میں آگے بڑھ رہا ہے۔ گو کہ عوام میں مایوسی کا توازن تبدیل رہتا ہے مگر پچھلے چالیس سالوں میں تو اس میں بگاڑ ہی پیدا ہوا ہے۔ تاہم عوامی عدم اعتماد کا سلسلہ حکومتی مشینری تک ہی محدود نہیں بلکہ یہ دائرہ تو سکولوں سے لے کر میڈیا تک پھیلا ہوا ہے۔ اس صورتحال میں زیادہ پریشان کن امر یہ ہے کہ عدم اعتماد کا یہ اظہار دو طرفہ ہے اور حکومتی اداروں میں کام کرنے والے اکثر افراد کی عام شہریوں سے متعلق رائے بھی کچھ زیادہ مثبت نہیں ہے۔

ریاست انڈیانا کے شہر مانسی کی سابق میئر کو انتخابات میں اس سبب شکست کا سامنا کرنا پڑا کہ نئی نوکریوں سے متعلق اس کا انتخابی وعدہ عوامی توقعات کے مطابق نہ تھا۔ دی نیشنل جرنل سے انٹرویو میں ان کا کہنا تھا کہ انہوں نے عوام سے اس لئے سچ نہیں بولا کہ لوگ ایسا کچھ سننے کیلئے تیار ہی نہیں تھے۔ وجہ دراصل یہ تھی کہ انہیں عوام پر اعتماد

نہیں تھا اور نتیجتاً انہوں نے ایک ایسی انتخابی مہم چلائی جو شہریوں کی خواہشات کے مطابق نہیں تھی۔

اس باہمی عدم اعتماد کی فضا میں پچھلے ایک عشرے میں مزید اضافہ ہوا ہے۔ سال 2001 سے 2012 کے درمیان بینکوں پر عوامی اعتماد کی شرح میں 24 فیصد کمی دیکھنے میں آئی۔ امریکی صدر سے وابستہ اعتماد میں بھی 23 فیصد کمی ہوئی۔ یہاں تک کہ سپریم کورٹ پر عدم اعتماد کرنے والوں کی شرح میں بھی 13 فیصد اضافہ سامنے آیا۔ نیشنل جرنل کے مطابق اس صورتحال کے پیچھے ایک بڑی وجہ عوامی تحفظات کے حوالے سے مناسب اقدامات کا نہ کیا جانا ہے۔ زیادہ خطرناک صورتحال یہ ہے کہ عدم اعتماد کی فضا صرف انہی اداروں تک محدود نہیں ہے۔ اکیسویں صدی کے آغاز ہی سے عوامی خدمات سے متعلق تمام ہی ادارے مخدوش حالات سے دوچار ہیں۔ یہاں تک کہ یہ ادارے معاشی، آبادیاتی اور ٹیکنالوجی سے متعلقہ تبدیلیوں سے متاثرہ افراد کی مدد کرنے میں بھی ناکام ہیں۔ میرے خیال میں ان حالات کے پیچھے کارفرما ایک دوسری وجہ بڑے اداروں کا عوامی قابو سے باہر ہونا بھی ہے۔

موجودہ سیاسی نظام کے نتیجے میں معاشرے میں اس قدر تقسیم پیدا ہو چکی ہے کہ اب مسائل کا حل نکالنے سے بڑھ کر دوڑ اس حد تک پھیل چکی ہے کہ مسائل کا حل کون نکالتا ہے۔ اکثر لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ انتخابات میں ووٹ ڈالنے کا حق عوام کی بجائے ان کے معاشی حالات پر ہوتا ہے۔ مفاد پرست ٹولہ دراصل تمام معاملات کنٹرول کرتا ہے۔ سیاستدان آسانی سے بدعنوان ہو جاتے ہیں اور کچھ لوگ تو یہ بھی شکایت کرتے نظر آتے ہیں کہ عوام کے ساتھ وہی سلوک ہو رہا ہے جس کے وہ حق دار ہیں۔ بعض گروہوں کی طرف سے اس میں میڈیا کو بھی ذمہ دار قرار دیا جاتا ہے اور یوں یہ بات بہت دور تک پھیلتی چلی جاتی ہے۔

اکیسویں صدی میں امریکہ معاشی لحاظ سے کمزور ہے نہ معاشرتی انحطاط کا شکار بلکہ اس کا سیاسی نظام مکمل طور پر ناکام ہو چکا ہے: فرید ذاکریا

زیادہ تر امریکی سیاستدان اس زندگی سے متعلق مکمل طور پر لاتعلق نظر آتے ہیں جو عام شہری جیتے ہیں۔ اس صورتحال کو ایک قدیم گانے کے الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے جس کا مطلب کچھ یوں ہے 'تمہاری آنکھوں میں مجھے اب میری تصویر نظر نہیں آتی'۔ ریاست الباما کی رہائشی ایک خاتون نے امریکی سیاستدانوں کو کچھ ان الفاظ میں یاد کیا کہ یہ لوگ اب عام امریکی سے متعلق کسی معاملے پر بات کرنے کو تیار نہیں ہیں اور ان کے گفتگو کے محور موضوعات کا عوام سے دور دور تک کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ عام طور پر ایسے جذبات کا اظہار قومی درجہ کے سیاستدانوں سے متعلق کیا جاتا ہے مگر عوام مقامی قیادت سے بھی کچھ زیادہ مطمئن نظر نہیں آتے۔ نیو میکسکو کی ایک خاتون نے شاید یہ الفاظ مقامی سیاستدانوں سے متعلق ہی کہے ہوں گے انہیں کسی صورت عوام کی یاد نہیں آتی یہاں

تک کہ یہ لوگ ہمارے کسی سکول میں ایک کوڑا اکٹھا کرنے والی ٹوکری بھی نصب نہیں کروانا چاہتے'۔عوامی رویے پر نظر رکھنے والے مشہور تجزیہ کار ڈین ینکلووچ کا کہنا ہے کہ موجودہ امریکی عوام اور سیاستدانوں کے نقطہ نظر ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہیں۔ یہاں تک کہ ان کے مسائل، توقعات اور بحث کے موضوعات تک میں کوئی مماثلث نظر نہیں آتی۔

'ذاتی طور پر سیاستدانوں سے متعلق بڑھتے ہوئے منفی جذبات میرے پریشانی کا باعث ہیں مگر وہی حقائق بیان کر رہا ہوں جو لوگوں کے طرف سے سننے کو ملتے ہیں۔ میں ایک سرکاری عہدے پر کام کرتا رہا ہوں جہاں میں نے کئی لائق اور قابل تعریف افسروں کے ساتھ مل کر کام کیا جو عوامی خدمت کے کام پر یقین رکھتے تھے'

مضبوط عوامی ہاتھوں کی ضرورت

موجودہ سیاسی نظام کو عوام کی طرف سے اس صورتحال سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جب آپ ٹیلی ویژن دیکھ رہے ہوں اور آپ کے ہاتھ میں موجود ریموٹ کنٹرول کام ہی نہ کر رہا ہو۔ اب اس کا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ریموٹ کی بیٹری خراب ہو چکی ہے یا اس میں کوئی دوسری خرابی پیدا ہو چکی ہے جو اس کے کام کرنے کی راہ میں رکاوٹ بن رہی ہے۔ اس حالت میں عوامی ردعمل کچھ ایسے الفاظ میں ہی سننے کو ملتا ہے جس میں لوگوں کا کہنا ہوتا ہے کہ موجودہ نظام ناکام ہو چکا ہے یا پھر ان کے سیاستدان بدل چکے ہیں۔ نتیجتاً موجودہ دور کے امریکی شہری نظام کو ایک مؤثر طریقے سے اپنے قابو میں رکھنا چاہتے ہیں چاہے یہ ادارے براہ راست ان کے کنٹرول میں نہ ہوں بلکہ کچھ ایسے افراد ان کی دیکھ بھال کریں جن پر لوگ اعتماد کر سکتے ہوں۔

جین جانسن، جنہوں نے پبلک ایجنڈا نامی تنظیم کے لئے ایک بحث کا تذکرہ کیا جہاں عوام نے مختلف مسائل بیان کئے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایسی بحث کے اختتام میں ہر کوئی اداروں پر عوام کے زیادہ کنٹرول کی بات کرنے لگا حالانکہ لوگوں کو اس ضمن میں عوامی کردار سے متعلق کوئی واضح طریقہ کار معلوم نہ تھا۔ اس بحث کا واضح نچوڑ یہی تھا کہ امریکہ کے موجودہ مسائل کا حل عوام کی طرف سے جمہوری نظام میں مزید آگے بڑھ کر حصہ لیا جانا ہی ہے۔ کیونکہ یہاں اکثر لوگوں کو کہتے سنا گیا کہ عوام کو خود پر اعتماد کر کے آگے بڑھنے کی ضرورت ہے تاکہ تبدیلی لائی جا سکے اور اس سلسلے میں لوگوں کو کچھ کرنے سے قبل ہی ہار مان لینے کے نظریہ سے جان چھڑانا ہو گی۔

مسلسل کوشش کرتے رہنے کا نظریہ لوگوں کیلئے حوصلہ افزا ہو سکتا ہے۔ ایسا ہی کچھ سال 2010 سے 2012 کے درمیان ہونے والی ایک تحقیق میں بھی سامنے آیا جس کے مطابق زیادہ تر شہری مقامی معاشرتی مسائل

کے حل کیلئے کوشاں تھے حالانکہ انہیں ان کی کوششوں کی کامیابی سے متعلق کئی خدشات بھی لاحق تھے۔ گو کہ عام امریکی شہری کسی حد تک مایوسی کا شکار ہیں مگر پھر بھی انہیں اپنے ملک کے حوالے سے کئی مثبت توقعات ہیں۔ لوگ ایک ایسے ماحول میں رہنا چاہتے ہیں جہاں انصاف کا بول بالا ہو، کوئی خوف وخطرہ نہ ہو اور لوگ اپنے ضمیر کی آواز پر فیصلے کرنے میں آزاد ہوں۔ ایک ایسی دنیا میں ہمارے بچے ہم سے بہتر ماحول میں آگے بڑھیں۔ امریکہ کی دوسو سالہ تاریخ میں امریکی ہمیشہ ہی پرامید رہے ہیں اور ایسے لوگ آج بھی موجود ہیں۔

امید ہی واحد راستہ ہے

حالانکہ زیادہ تر لوگ امید ہی سے بندھے رہنا چاہتے ہیں مگر پھر بھی یہ ایک نازک معاملہ ہے۔ ایک تحقیق کے دوران جس میں مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے انٹرویوز سے نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، منیسوٹا سے تعلق رکھنے والے ایک شخص نے انتہائی مثبت انداز میں کہا کہ عوام اپنا حصہ ڈالنا چاہتے ہیں اور وہ اس ضمن میں ایسے راستے ہی تلاش کررہے ہیں جن کے ذریعے وہ کوئی بہتر کردار ادا کرسکیں۔ اسی موقع پر ایک خاتون جو کہ قدرے کم پرامید تھیں کا کہنا تھا کہ جب ہم لوگوں کو بتاتے ہیں کہ ان کے ہاتھوں میں پہلے سے زیادہ طاقت ہوگی تو جو کچھ بھی ہم کہہ رہے ہوتے ہیں اس پر ہمیں یقین ہوتا ہے مگر ساتھ ہی ہمیں کسی قدر ایک غیر یقینی صورتحال کا بھی سامنا ہوتا ہے کہ نہیں معلوم کس حد تک یہ بات واقعی حقیقت میں تبدیل ہوسکے گی۔ جزیرے رہوڈز سے تعلق رکھنے والی ایک عورت کا بھی یہی خیال تھا کہ جب وہ لوگوں سے بات کرتی ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ لوگوں میں احساس ذمہ داری ہے اور وہ کچھ کرنا بھی چاہتے ہیں مگر وہ اس بات سے ناآشنا ہیں کہ وہ کیا کردار ادا کرسکتے ہیں۔

امریکیوں کو ابھی بھی اپنے ملک پر پورا یقین ہے کیونکہ ڈوب کر ابھرنا ان کے خون میں شامل ہے۔ مگر ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جو سمجھتے ہیں کہ امریکہ کی ناکامی کی وجہ ہی یہ ہے کہ امریکیوں میں اب پہلے سی اقدار نہیں رہیں۔ موجودہ دور کے امریکی اپنی لاپرواہی کے سبب مادیت پسندی کا شکار ہوچکے ہیں جس کی بہترین مثال وال سٹریٹ ہے جہاں لوگوں کی آنکھوں میں صرف اور صرف لالچ ہے۔ تاہم ہارووڈ انسٹیٹیوٹ فار پبلک انوویشن کی طرف سے کی جانے والی ایک تحقیق میں یہ بات سامنے آئی کہ لوگ ایک ایسے نظام کا قیام میں عمل میں آتا دیکھنا چاہتے ہیں جس میں ایمانداری کی قدر اور لالچ کی حوصلہ شکنی ہو اور انہیں سماجی ذمہ داری پوری کرنے پر انعام سے نوازا جائے۔

'لوگوں کی آراء جاننے کے بعد احساس پیدا ہوتا ہے کہ شاید عوام بری طرح کسی ہیجانی کیفیت کا شکار ہوچکے ہیں۔ مجموعی طور پر لوگوں میں امید اور خوف کے مختلف جذبات پائے جاتے ہیں جن

پر وہ قابو پانے کی کوشش کر رہے ہوتے ہیں۔تاہم اس دوران وہ 'اگر مگر' کی سی صورتحال کا شکار ہیں۔اگرچہ یہ رائے بذات خود غیر واضح ہے تاہم پھر بھی یہ ایک مجموعی صورتحال کی عکاسی ضرور کرتی ہے۔'

جہاں امریکی الگ الگ کام کرنا جانتے ہیں وہ یہ بات بھی سمجھتے ہیں کہ انہیں مل کر کام کرنے کی ضرورت ہے اور یہی ان کے بچاؤ کا راستہ بھی ہے۔لوگ اس ضمن میں ایک پرانی کہاوت سے بخوبی واقف ہیں کہ انہیں کچھ لینے کیلئے کچھ دینا بھی پڑے گا مگر دوسری جانب کچھ لوگوں کے مطابق شہریوں کی دل میں دوسروں کی قدر کا نام و نشان تک نہیں۔یہاں تک کہ وہ دوسروں کی عزت کرنے میں بھی وہ کنجوسی سے ہی کام لیتے ہیں۔

موجودہ صورت حال کا حل

چھوٹے منصوبوں کیلئے تو عام طور پر شہری دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں تاہم جہاں ملک وقوم کیلئے کام کرنے کی بات آتی ہے وہاں صورتحال کچھ مختلف ہوتی ہے اور لوگ اپنا کردار متعین کرنے یا اپنی سکت کے مطابق حصہ ڈالنے میں ناکام نظر آتے ہیں۔گھریلو سطح پر تبدیلی لانا تو آسان نظر آتا ہے مگر بڑے پیمانے پر کسی ادارے میں زیادہ لوگوں کے ساتھ مل کر کام کرنے کیلئے مجموعی ارادہ، کوشش اور اعتماد کی ضرورت ہوتی ہے۔اگر چند ہمسائے مل کر سکول کی عمارت پر رنگ کرنے کیلئے نکلیں تو اس کا اس سے بڑھ کر کوئی فائدہ نہیں ہوتا کہ عمارت دلکش نظر آئے گی تاہم اس سرگرمی کو ایک اور نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ شہری آپس میں مل جل کر کچھ کرنا چاہیں تو کیا کچھ کر سکتے ہیں۔

رچ ہارووڈ نے عوامی رویوں سے متعلق ایک تحقیق میں یہ نتیجہ اخذ کیا کہ کچھ ایسے کام شروع کرنے کی ضرورت ہے جن سے نئی روایت کی داغ بیل ڈالی جائے، کوئی ایسا کام کیا جائے جو اپنی تکمیل کے مرحلے تک بھی پہنچے تاکہ لوگوں کا اعتماد بحال کیا جا سکے۔انہوں نے اس سلسلے میں ڈیلاس کی رہائشی ایک خاتون کا تذکرہ بھی کیا جس کا کہنا تھا کہ صرف پہلا قدم اٹھانے کی ہی ضرورت ہے بعد میں لوگ اس بات کا انتظار نہیں کریں گے کہ کوئی اور ان کی جگہ کام کرے۔اس عورت کا خیال تھا کہ مقامی سطح پر کام شروع ہو جائے تو لوگ اس کو جاری رکھیں گے اور حالات تبدیل ہوتے جائیں گے۔ڈینویر سے تعلق رکھنے والی ایک دوسری خاتون کا مشورہ بھی یہی تھا کہ کسی چھوٹے سے کام سے آغاز تو کیا جائے۔ڈیٹرویٹ کے ایک رہائشی کا کہنا تھا کہ سماجی کاموں میں لوگوں کے شامل ہونے کی ضرورت ہے، اگر یہ کام شروع ہو جائے تو اس کے بعد کئی بڑے مواقع پیدا کئے جا سکیں گے۔

ہاووڈ کا خیال ہے کہ مقامی سطح پر وقوع پذیر ہونے والے معاملات کا قومی رویے سے بھی براہ راست تعلق ہے۔ان کا کہنا ہے کہ جن لوگوں سے ہم ملتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ آج امریکہ کو کئی مسائل کا سامنا ہے اور

انہیں حل کرنے کی ضرورت ہے۔ایک محدود پیمانے سے کام کا آغاز کرنے کا واحد مقصد عوام کا اعتماد بحال کرنا ہے تا کہ مشترکہ مفادات کو لے کر آگے بڑھا جا سکے۔

مگر عالمی معاملات کا حل کیسے نکالا جائے؟ جو لوگ ان منصوبوں کا آغاز چھوٹی سطح سے کرنا چاہتے ہیں ان کا یہ بھی خیال ہے کہ اگر لوگوں کو افادیت کا احساس نہیں ہوا تو یہ کام زیادہ عرصے تک جاری رکھنا مشکل ہوگا۔مگر ان کا اصرار ہے کہ مقامی کوششوں کی نتیجے میں بڑی تحریکوں کو جنم دیا جا سکتا ہے۔

میں آگے جا کر اس پر تفصیل سے بات کروں گا کہ ایسے کئی طریقے ہیں کہ جس سے لوگوں کو یقین دلایا جا سکتا ہے کہ سب کچھ دراصل ان کے قابو میں ہی ہے اور وہ اپنا یہ حق بڑھ چڑھ کر استعمال کر سکتے ہیں۔لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ ایسے مواقعوں سے عام طور پر سیاست کے بارے میں پائے جانے والے اس عام تاثر کے سبب فائدہ نہیں اٹھایا جاتا کہ سیاستدان صرف حکومت کے ذریعے ہی کام کرتے ہیں۔تاہم اگر یہی کام عوام کے ذریعے کئے جائیں تو نہ تو انتخابات کی ضرورت ہے اور نہ ہی حکومت کی۔ بلکہ انسانی عقل کے مطابق تو اس کا سیاست سے بھی کوئی تعلق نہیں ہوگا۔تاہم اس بات کو نہ سمجھنے کے سبب لوگوں میں یہ تاثر بڑھتا جا رہا ہے کہ صرف شہریوں کی وجہ سے کوئی فرق نہیں پڑ سکتا۔

وہ سیاست جسے لوگ سیاست سمجھتے ہی نہیں

میرا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ملک میں انتخابات یا حکومت کی کوئی ضرورت نہیں اور عام شہری ہی حکومت چلا سکتے ہیں۔ بلکہ ایسا کچھ کہنا تو مضحکہ خیز ہوگا۔میرا کہنا یہ ہے کہ ہمارے ملک کی سیاست دو مختلف سطحوں پر چلتی ہے اور ان کا آپس میں بہت گہرا تعلق ہے۔انتخابات اور حکومتوں کا قیام وہ سیاست ہے جس کو عام پر لوگ 'سیاست' کے طور پر جانتے ہیں۔اس میں مختلف ادارے کام کرتے ہیں اور اس مقصد کیلئے قوانین تشکیل پاتے ہیں۔دوسری سیاست جس کا تعلق شہریوں سے ہے کو عام طور پر کم جانا جاتا ہے اور عوام اس کی واضح تعریف سے بھی ناواقف ہیں۔ یہاں تک لوگ اس عمل کو سیاست کا نام دینے سے بھی کتراتے ہیں۔

کچھ فلسفہ دانوں نے اس سیاسی عمل کا تذکرہ زندگی کے ان کاموں کی صورت میں کیا ہے جو ہم ووٹ ڈالنے اور ٹیکس دینے سے ہٹ کر کرتے ہیں۔بعض افراد نے اسی امر کو سماجی زندگی کا نام دیا ہے۔حال ہی میں اس کیلئے 'سول سوسائٹی' کا لفظ بھی استعمال کیا جانے لگا ہے جس کے تحت وہ کام کئے جاتے ہیں جو لوگ آپس میں مل جل کر دوسرے لوگوں کیلئے کرتے ہیں۔ میں اس کیلئے 'شہری سیاست' کا لفظ استعمال کرتا ہوں کیونکہ ڈکشنری میں لفظ جمہوریت یا ڈیموکریسی کا مطلب بھی یہی ہے۔

میری سیاست سے مراد 'سینڈی' اور اس کے اردگرد کے لوگوں کا اس ضمن میں اقدامات اٹھانا ہے کہ ان

کی آنے والی نسلیں تعلیم یافتہ ہوں۔ یہ ان لوگوں سے متعلق ہے جو 'میکس' کے فارم پر رہتے ہوئے کئی مصیبتیں صرف اس وجہ سے سہہ رہے ہیں کیونکہ یہ ماحول کیلئے بہتر ہے۔ یہ 'سو' اور اس کے دوستوں سے متعلق ہے جو مقامی وسائل کا استعمال عمل میں لا کر مقامی مسائل حل کر رہے ہیں۔ اس سیاست کا تعلق لوگوں کی ذاتی زندگی اور ان کے روزانہ کے تجربات سے ہے۔ یہ سیاست ایسے جگہوں سے جڑی ہوئی ہے جنہیں عام طور پر سیاست سے غیر متعلق سمجھا جاتا ہے۔ میری سیاست کی بات کا تعلق دوپہر کا کھانا کھانے کے مقامات، کافی کی دکانوں اور لمبی قطاروں سے ہے۔

'ایک دفعہ مجھے ایک افریقی شہری نے بتایا کہ ان کے ملک میں لوگ سیاست سے متعلق زیادہ بات نہیں کرتے اور وہ اس حوالے خوفزدہ ہی رہتے ہیں۔ اس کے باوجود لوگ بازاروں میں، دیہاتی سکولوں میں ہونے والی تباہی اور خشک سالی کا مقابلہ کرنے کی تدبیروں پر بحث کرتے نظر آتے ہیں۔ لوگ اس گفتگو کو سیاست نہیں سمجھتے تاہم اس شخص کے خیال میں یہ سیاست ہی ہے۔'

ایسا سیاسی عمل جس کا تعلق براہ راست شہریوں سے ہو اس میں شاید یہ بات غیر واضح رہے کہ اس کا مقصد کیا ہے۔ یہاں تک ایسا عمل امریکی شہریوں کی زندگی کا خفیہ سیاسی عمل کہلایا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ لیکن اگر لوگوں کو احساس ہو جائے یہ ہرگز کوئی خفیہ عمل نہیں بلکہ یہ توان کی روزانہ کی زندگی کا حصہ ہی ہے۔ اس احساس کے ساتھ ہی ان کی زندگی بدل جائے گی اور وہ شہریوں کی زندگیاں بدلنے سے متعلق ایسے مواقع دیکھنے لگیں گے جو عام لوگوں کی سمجھ سے ہی بالاتر ہوں گے۔ لیکن یہ سوچ کوئی کتاب پڑھنے سے پیدا نہیں ہوگی بلکہ ذاتی زندگی میں دوسروں کیلئے کام کرنے سے ہی پیدا ہوگی۔

یہ سیاست ایک کھلا راز ہے جو ہزاروں شہریوں کی زندگیوں میں عارضی تحریکوں کی صورت میں موجود ہے جس میں لوگ سڑکوں سے گندگی ہٹانے کیلئے بھی کام کرتے ہیں اور ماحول کی حفاظت کیلئے بھی کوشاں ہیں۔

تجدید معاشرت

معاشرے میں پھیلتی ہوئی مایوسی کے باوجود حالیہ سالوں میں شہریوں کے جانب سے کئی اقدامات اٹھائے گئے ہیں جس کی وجہ سے کہا جا سکتا ہے کہ معاشرت میں کسی حد تک مثبت تبدیلی ضرور آ رہی ہے۔ اگرچہ یہ اقدامات مختلف وجوہات کے سبب اٹھائے گئے ہیں مگر پھر بھی ایک جمہوری ملک میں اس کا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شہری ایک بار پھر اس نظام کا محور بننے جا رہے ہیں۔

ایسی سیاست جس کا مرکز عوام ہوتے ہیں، وہ اپنا مخصوص لٹریچر بھی تشکیل دے رہی ہے۔ بین باربر نے

ایسی سیاست کو مضبوط جمہوریت کا نام دیا ہے اور انہوں نے اسی نام سے ایک کتاب بھی تحریر کی ہے۔ ان کی کتاب کو ہیری بیوٹ کی کتاب 'دی بیک یارڈ ریولوشن' سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ حالانکہ یہ کتابیں کچھ عرصہ پہلے لکھی گئی تھی تاہم ان کے نظریات ابھی بھی تازہ ہیں جیسا کہ میٹ لیہنگر کی کتاب 'دی نیکسٹ فارم آف ڈیموکریسی' میں جمہوریت کی نئی تعریف کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسی طرح کا ایک مقالہ 'اے پرابلم بیسڈ اپروچ ٹو ڈیموکریٹک سسٹم' مارک وارن نے بھی تحریر کیا ہے۔

کارمن سیریانی اور لیوس فرائیڈ لینڈ کی کتاب 'سول انوویشن ان امریکا' میں بھی تجدید معاشرت کو بحث کا موضوع بنایا گیا ہے اور اسی طرح کے کچھ خیالات کا تذکرہ پیٹر لیون کی کتاب 'وی آر دی ونز وی ہیو بین ویٹنگ فار' (We are the one's we have been waiting for) میں بھی ملتا ہے۔ اسی طرح کی سینکڑوں کتابیں تحریر کی جا چکی ہے اور زاویرڈی سوئیزا کی کتاب 'ڈیموکریسی ایز پرابلم سالونگ' کے بغیر ایسی کوئی فہرست مکمل نہیں ہوسکتی۔

'میرا خیال ہے کہ جمہوریت کا کسی حد تک مسائل کے حل سے تعلق تو ہے مگر اسے صرف یہیں تک محدود کر دیا جانا درست عمل نہیں ہوگا۔ اس خیال کے سبب جمہوریت ایک چھوٹی چیز بن کر رہ جاتی ہے۔ حالانکہ جمہوریت کا تعلق منتقلی کی بجائے تبدیلی سے ہے۔'

وہ کام جو شہری کرتے ہیں اس کا تعلق ان اشیاء کی فراہمی سے ہے جو مختلف مسائل کے حل کیلئے ضروری ہوتی ہیں۔ برگز کا خیال ہے کہ معاشرہ فیصلہ سازی یا منصوبہ سازی میں بحیثیت مجموعی کام کرتی ہے اور اس کا سبب یہ ہرگز نہیں ایسے منصوبوں کیلئے مقامی وسائل ہی درکار ہوتے ہیں بلکہ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ عوامی مسائل پر کام کرنے کیلئے مقامی طور پر ایک موثر نظام کی موجودگی بھی ضروری ہوتی ہے۔ اس نے ایک قدم آگے بڑھ کر اس بات پر بھی بحث کی ہے کہ مختلف معاشرتی حکمت عملیاں بڑے پیمانے پر جمہوری نظام کی بھی عکاسی کرتی ہیں۔ ایک ایسا جمہوری نظام جس میں محض عوامی آواز بلند کرنے اور لوگوں کو ریلیوں میں شامل کرنے سے آگے کی بات کی جا رہی ہو۔ بدقسمتی سے امریکہ میں معاشرتی کوششوں کو یا تو نظرانداز کر دیا جاتا ہے یا پھر ان کو اس قدر پزیرائی نہیں ملتی جس کی وہ حقدار ہوتی ہیں۔ تاہم مجھے ان تحقیقات کا تذکرہ کرتے ہوئے خوشی محسوس ہو رہی ہے جس میں ایسی کوششوں کے مؤثر ہونے کی بات کی گئی ہے۔ سب سے اہم کام الینر اوسٹرم کا ہے جس کے سبب انہوں نے 2009ء میں اکنامکس کے میدان میں نوبل انعام بھی جیتا تھا۔ انہوں نے مشترکہ وسائل کے انتظامات میں مقامی شہریوں کے کردار کی اہمیت پر بہترین انداز میں روشنی ڈالی ہے۔

سال 1990 میں میں نے 'پالیٹکس فار پیپل' (Politics for People) میں شہری سیاست سے متعلق مضامین تحریر کئے اور آج مجھے خوشی ہے کہ جو کچھ اس وقت جمہوریت اور سیاست سے متعلق نیا تھا آج اس سب کو کتابوں اور تحقیقات میں تسلیم کیا جا رہا ہے۔ مثال کے طور پر باب پٹنام کی یہ دلیل آج مکمل طور پر تسلیم کی جاتی ہے کہ جمہوری نظام کیلئے سول سوسائٹی کا کردار غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ یہی نظریہ طاقت سے متعلق بھی درست ہے کیونکہ طاقت صرف دوسروں پر حکمرانی کا ہی نام نہیں بلکہ یہ شہریوں کے ایک دوسروں سے تعلقات سے بھی جڑی ہوئی ہے۔ جیسا کہ اوسٹرم کا کہنا ہے کہ بعض اوقات مقامی حالات کے بارے میں لوگوں کی معلومات کسی ماہر سے زیادہ بہتر ہوسکتی ہیں۔ حالانکہ ماہر جو کہ سائنسی طریقہ کار کا استعمال کرتا ہے وہ اس نظام میں بالا دست ہوگا۔ جہاں بات سیاست سے جڑے ہوئے معاملات کی ہو رہی ہو وہاں اس طرح کی کئی اور دلیلیں بھی پیش کی جاسکتی ہیں۔

ان سب دلیلیوں کا مقصد ہرگز یہ کہنا نہیں کہ شہری ہی دراصل کُل طاقت ہیں جو مفاد پرست ٹولوں کو شکست دے سکتے ہیں یا تمام اداروں میں تبدیلی لا سکتے ہیں اور عالمی معاشی بھونچال کا حل نکال سکتے ہیں۔ ایسے شہری جو کوئی بھی مثبت تبدیلی لانا چاہتے ہیں انہیں کئی قسم کی مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ کچھ لوگ ان کاموں کے بارے میں سمجھتے ہیں کہ انہیں پورا کرنے کیلئے زیادہ وقت درکار ہوگا اس لئے وہ اعتراض اٹھانے لگتے ہیں اور یوں ان لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہے جو عام لوگوں کی قوت فیصلہ یا اہلیت پر سوال اٹھا رہے ہوتے ہیں۔ اور پھر اداروں سے رجوع کرنے والے لوگوں کو عدم تعاون، براہ راست رکاوٹ یا کوئی دوسرا بہانہ تراش کر پریشان کیا جاتا ہے۔

یہ بات سچ ہے کہ ماہرین کی سرپرستی کے بغیر ناتجربہ کار نوجوان رضاکار شاید کچھ نہیں کرسکتے اور پھر سماجی تنظیموں کی طرف سے عام شہریوں کو ایسے کام پر لگایا جانا جس میں قانون کی خلاف ورزی کا امکان موجود ہو بھی کئی مشکلات پیدا کرسکتا ہے۔ مالی معاملات کی دیکھ بھال بھی ایک بڑا مسئلہ ہوسکتا ہے۔

سرکاری ملازمین بھی بسا اوقات شہریوں کی طرف سے عدم تعاون کی وجہ سے شدید پریشانی کا شکار ہوسکتے ہیں اور پھر وہ عام لوگوں کو کاموں میں شامل کرنے سے متعلق اپنے ساتھیوں کی شکایات کے جھنجھٹ میں بھی پڑ سکتے ہیں۔ مزید برآں حکومت کی طرف سے ہزاروں ایسے اقدامات کہ جن کے سبب ایسا محسوس ہو کہ سرکاری ملازمین بڑی محنت سے عوامی خدمت میں لگے ہوئے ہیں، کے باوجود بھی عوام غیر مطمئن ہی رہتے ہیں اور نتیجتاً یہ صورتحال بھی افسران ہی کیلئے پریشانی کا باعث بنتی ہے۔

سیاسی ماحول

یہ بات تسلیم کی جانی چاہئے کہ شہریوں کے اقدامات کے سبب اگر چہ کوئی انتہائی معمولی تبدیلی ہی رونما ہوتی ہے مگر یہی وہ چیز ہے جو زندگی میں اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ تبدیلی چاہے چھوٹے سے پیمانے پر ہی شروع ہو جیسا کہ کچھ ہمسائے آپس میں مل کر اپنے علاقے میں ایک باغ قائم کر دیں یا مقامی پارک کی حالت بہتر کر دیں۔ پھر بھی یہ اقدامات معاشرے میں بڑھتے منفی ماحول کیلئے دوا کی حیثیت رکھتے ہیں۔اور پھر مل کر کام کرنے کی وجہ سے معاشرے میں ذمہ داری اور ممکنات کی فضا پیدا ہوتی ہے۔

مثال کیلئے مسیسپی کے شہر ٹپیلو نے غریب ترین ریاست کے غریب ترین علاقے کے غریب ترین شہر ہونے کے باوجود خود کو جدید ترین شہر بنا کر بہترین معاشی اور معاشرتی نمونے کی صورت اختیار کر لی ہے۔وہاں بھی تبدیلی کا آغاز نواحی دیہاتوں میں رہنے والے ان لوگوں نے ہی کیا جنہوں نے اپنی مدد آپ کے تحت کچھ کرنے کا سوچا اور پہلا قدم اٹھایا۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہاں کا سیاسی ماحول تبدیل ہوا اور اس کا اثر پورے علاقے میں پھیل گیا۔واہن گریشم نے اس سارے عمل کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور بعد ازاں اس کا تذکرہ اپنی ایک تحقیق میں کیا۔

سینڈی، میکس اور سو جیسے دیہاتی جنہوں نے اس کام میں پہل کی انہیں اس علاقے کے سیاسی ماحول کے ماہرین قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ یہی لوگ تھے جنہوں ٹپیلو میں مسائل کے حل کیلئے مختلف وسائل تلاش کئے۔ انہیں ابتداء میں جو وسائل دستیاب ہوئے ہوں گے وہ یقیناً انسانی تجربے کی بنیاد پر ہی میسر آئے ہوں گے۔یوں یہ سب شہریوں کے آپس کے تعلق اور علم کی نسل در نسل منتقلی کے نتیجے میں ممکن ہوا کیونکہ مسائل کے حل تو ان کے اپنے سیاسی ماحول میں ہی موجود تھے۔

جمہوریت کیلئے کام بھی خدمت ہے

اس کتاب کا مقصد شہریوں کو یہ پیغام دینا ہے کہ وہ ایسے کاموں کا حصہ بنیں جن کے ذریعے معاشرے میں موجود بنیادی مسائل کا حل ممکن ہے۔سماجی کام ہی وہ واحد طریقہ ہے جس سے لوگ اپنے آپ کو مضبوط کر سکتے ہیں۔ایڈگر کاہن نے یہی بات زیادہ واضح الفاظ میں کہی ہے کہ جمہوریت کیلئے کام کرنا بھی دراصل خدمت ہی ہے۔

جو کام عام لوگ کر رہے ہوتے ہیں وہ قدرے مشکل ہوتا ہے اور اس بات کا بھی امکان موجود ہوتا ہے کہ اس میں کئی رکاوٹیں سامنے آئیں یا وہ کام تاخیر کا بھی شکار ہو جائے۔ایسے کام بغیر کسی ذاتی فائدے کے کئے جا رہے ہوتے ہیں اور اس کی وجہ سے نہ کسی کو بڑا نام ملتا ہے اور نہ کوئی تعریفی اسناد۔اس کے باوجود ایسے کام لوگوں کو مزید طاقتور بناتے ہیں اور انہیں جمہوری نظام میں ایک مستحکم مقام مہیا کرتے ہیں۔

ایسے کام کرنے کیلئے جو وسائل درکار ہوتے ہیں شہری انہیں اجتماعی کوششوں سے دستیاب کرتے ہیں اور

پھر مجموعی طور پر انہیں بروئے کار بھی لاتے ہیں۔ مختلف منصوبے جیسا کہ بے گھر افراد کیلئے گھر مہیا کرنا یا بچوں کو گلیوں میں نکلنے سے روکنا کیلئے اجتماعی فیصلہ سازی کی ضرورت ہوتی ہے اور بعد از تکمیل یہ منصوبے تمام لوگوں کو یکساں طور پر فائدہ دیتے ہیں۔ یہ وہ طریقہ ہے جس کے ذریعے شہری محض کسی علاقے کے رہائشی، صارفین، ووٹرز اور ٹیکس دہندہ سے آگے بڑھ کر 'پروڈیوسر' کی حیثیت اختیار لیتے ہیں۔ ایسے ماحول میں لوگوں کو ان کے ریاست کے ساتھ تعلقات کی بنیاد پر ہی نہیں بلکہ دوسرے شہریوں کے ساتھ تعلقات کی بنا پر پرکھا جانے لگتا ہے۔

میں یہاں یہ بھی واضح کرنا چاہتا ہوں کہ ایسے ماحول کا قیام عمل میں لانے کیلئے کوئی مخصوص ترکیب نہیں ہے بلکہ یہ ایک مسلسل سیکھتے رہنے کا عمل ہے جو ہمیشہ جاری رہتا ہے اور سیکھنے کا یہ عمل بھی مجموعی طور پر ہی جاری رہنا چاہئے۔ سماجی کاموں میں مستقل مزاجی اور کامیابی کا عنصر مسلسل کوشش سے ہی پیدا کیا جا سکتا ہے۔ پھر چاہے ہر کوشش ناکام ہی ہو لوگوں کا ارادہ اور امید ہرگز نہیں ٹوٹنی چاہئے۔ یعنی کہ لوگوں کو اپنی غلطیوں سے سیکھ کر مسلسل آگے بڑھتے رہنے کی عادت اپنانا ہوگی۔

پوری کوشش کے بعد ناکام ہونا بھی ایک عظیم ترین ہنر ہے: چارلس ایف کیٹرنگ

تمام سماجی منصوبوں میں سیکھنے اور عمل کرنے کا عمل بیک وقت جاری رہتا ہے۔ اس کی مثال ایسے ہی ہے کہ کام کرنا صرف کیلوں کی مدد سے لکڑی کے تختوں کو آپس جوڑنے تک ہی محدود نہیں ہوتا بلکہ اس عمل کے دوران نئی نئی ایجادات کا سفر بھی جاری رہتا ہے۔ ان کاموں کی انجام دہی کے دوران ایسے مواقعوں کی نشاندہی بھی کی جاتی ہے جن کو شاید درست طریقے سے استعمال نہیں کیا گیا ہوتا۔ گویا سیکھنے کا عمل بھی کام ہی کا حصہ ہوتا ہے بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ سیکھنے کے بغیر کام نامکمل رہتا ہے۔

یہ کتاب حرف آخر نہیں

یہاں یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ ایسے تمام کام جنہیں سماجی امور میں نمٹایا جانا اس کتاب میں بطور مثال شامل کیا گیا ہے ضروری نہیں کہ ان کو ہر جگہ حقیقت میں بھی تبدیل کیا جا سکے۔ یہ کتاب کامل علم نہیں ہے اور نہ ہی اس میں تمام سوالوں کے جوابات موجود ہیں۔ اس میں ایسے واقعات کا ذکر کیا گیا ہے جس پر عمل کر کے ممکن ہے معاشرے میں مثبت تبدیلیاں لائی جا سکیں مگر یہ کوئی تجربہ شدہ خیالات نہیں ہیں۔ بلکہ یہ لوگوں کو سیاست، جمہوریت، شہریوں کے بارے میں ایک نئے زاویے سے سوچنے پر اکسانے کی کوشش ہے جس میں عوام کو جمہوریت کے مسائل کے پیچھے موجود وجوہات کا علم ہو سکے۔ اور انہیں ایسے مواقعوں کا احساس دلایا جا سکے جن کے بارے میں انہوں نے پہلے کبھی سوچا ہی نہیں۔

آپ شاید یہ سوچ رہے ہوں کہ آپ نے جو بھی مثالیں ابھی ابھی پڑھیں ہیں ان میں سے کئی ایسی بھی ہیں کہ جن پر آپ کے معاشرے میں بھی عمل کیا جاسکتا ہے۔ کیا یہ واقعی قابل عمل ہیں؟ یا آپ کو واقعی موجودہ طریقہ کار ترک کر کے کچھ نیا کرنے کی ضرورت ہے؟ اس طرح کے کئی سوال آپ کے ذہن میں بھی پیدا ہوئے ہوں گے۔

اس کتاب میں بیان شدہ کتنی باتوں پر عمل کیا جاسکتا ہے اس بات کا تعلق براہ راست آپ کے مقامی حالات سے ہے کہ آپ کے پاس کونسے وسائل دستیاب ہیں اور آپ کے مسائل کی نوعیت کیا ہے۔ کوئی بھی شخص تمام معاشروں میں زندگی کی حقیقتوں سے واقف نہیں اور کسی بھی جگہ کچھ نیا کرنے کیلئے پہلے کسی بھی ترکیب کا آزمانا ضروری ہے۔ اس کتاب میں شامل کی گئی تحقیقات سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ کسی بھی معاشرے میں موجود مسائل کا حل لوگوں کے تجربات کی روشنی میں ہی نکالا جاسکتا ہے۔

کیٹرنگ فاؤنڈیشن جس نے اس کتاب کے لئے مطلوبہ تحقیقات دستیاب کیں ایک غیر منافع بخش اور غیر سرکاری ادارہ ہے۔ اس کتاب میں شامل کی جانے والی تمام تر تحقیق ایسے لوگوں کی جانب سے کی گئی ہے جو زندگی کو بہتر طریقے سے گزارنے کے مختلف طریقے ڈھونڈنے پر کام کر رہے ہیں۔ یہ لوگ جمہوریت کے سبب پیدا ہونے والے مسائل کے پیچھے موجود وجوہات جاننے کیلئے کام کرتے ہیں اور کیٹرنگ فاؤنڈیشن کو نئے نئے تجربات سے آگاہ کرتے ہیں۔ یہ ادارہ ان تمام تجربات کی روشنی میں ایسے عملی طریقہ کار وضع کرتا ہے جنہیں زندگی کے مختلف حصوں میں شامل کیا جاسکے۔ اس کتاب میں شامل کہانیاں بھی دراصل کہانیاں ہی ہیں اور ان کا باقاعدہ سماجی تحقیقات سے کوئی تعلق نہیں۔

اس سارے عمل میں جہاں لوگوں کو کوئی نئے جوابات تو نہیں ملتے مگر انہیں اپنی زندگی کو دیکھنے اور اس میں موجود مسائل کے حل کیلئے کوئی نیا نقطہ نظر ضرور میسر آتا ہے۔ کسی بھی مسئلے کو حل کرنے کیلئے اس سے متعلق مختلف زاویے ہونا ضروری ہوتے ہیں۔ ان مختلف زاویے کے حامل لوگوں کا آپس میں تبادلہ خیال ہی بعض اوقات انہیں ایک بار پھر اپنے آپ سے ملنے کا موقع فراہم کرتے ہیں اور انہیں سیکھنے کا بھی موقع ملتا ہے۔ یہ کتاب بھی ایسے ہی کئی لوگوں کی تحقیقات کے نتیجے میں لکھی گئی ہے جو کسی نہ کسی طرح سے کیٹرنگ فاؤنڈیشن سے جڑے ہوئے ہیں۔
اس ساری کوشش کا مقصد اس بات سے متعلق آگاہی پھیلانا ہے کہ جمہوریت کو کیسے کام کرنا چاہئے حالانکہ اس سوال کا واضح جواب تو شاید کسی کے پاس بھی نہیں ہے۔ مگر اس کا ایک جواب تو جمہوریت لفظ میں بھی موجود ہے جو کہ عوام سے جڑا ہوا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ جمہوریت نہ تو باہر سے لانے کی ضرورت ہے اور نہ ہی کہیں باہر بھیجنے کی ضرورت ہے بلکہ یہ نظام تو کسی معاشرے کی اپنی روح سے ہی پیدا کیا جاسکتا ہے۔

بظاہر یہ کتاب امریکہ سے متعلق ہے مگر کیٹرنگ فاؤنڈیشن نے کیوبا سے لے کر افریقہ تک اور روس سے

لے کر آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ تک میں موجود تحقیق کاروں سے بھی سیکھا ہے۔

عام طور پر جب لوگوں کو بتایا جائے کہ ہمارا ادارہ کوئی تجربہ کر رہا ہے تو جب انہیں جمہوریت کے مسائل کے پیچھے کارفرما وجوہات کے متعلق پوچھا جاتا ہے وہ وہی جوابات دیتے ہیں جو انہیں ذاتی زندگی کے تجربات کے دوران معلوم ہوئے ہوتے ہیں۔انہیں تجربات کی بنیاد پر ہمارے ادارے نے ایسے کئی مواقعوں اور مسائل کی نشاندہی کی ہے جن کے ذریعے لوگوں کو جمہوری نظام میں اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ سے حاصل ہوسکتا ہے۔

میں یہ بھی واضح کرنا چاہتا ہوں کہ ہماری تحقیقات کسی صورت بھی حتمی نہیں ہیں اور ہمارا ادارہ بھی مسلسل سیکھنے کے عمل سے گزر رہا ہے۔کسی بھی معاشرے کے مسائل حل کرنے اور جمہوریت کو مضبوط کرنے کیلئے بھی سیکھتے رہنا ایک ضروری فعل ہے اور ہمارا ادارہ بھی اسی اصول پر کارفرما ہے۔

☆☆☆☆

باب سوم

سیاسی ماحول

کسی بھی معاشرے کا سیاسی ماحول شہریوں کے آپس کے تعلقات اور اداروں کے کردار کا مجموعہ ہوتا ہے جبکہ ان دونوں پہلوؤں کا بھی آپس میں گہرا تعلق ہے۔ سیاست کا آغاز ہمیشہ محدود پیمانے سے ہوتا ہے جیسا کہ دوست احباب، ہمسائے یا جان پہچان والے لوگ ہی ابتدائی طور پر کسی کو کچھ کر گزرنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ اس کے بعد قانون ساز اسمبلیاں، حکومت اور غیر سرکاری تنظیمیں دیگر مواقع فراہم کرتے ہیں۔

کسی معاشرے میں سیاسی ماحول کی تشکیل کیلئے جب بھی شہریوں اور اداروں کے باہمی تعلق کی بات ہوتی ہے تو میرے ذہن میں 'ماحولیات' کی اصطلاح آتی ہے۔ کیونکہ قدرتی ماحول میں بھی مختلف عوامل کے آپس کے تعلقات ہی کی وجہ سے مخصوص حالات پیدا ہور ہے ہوتے ہیں۔ سیاست میں بھی بالکل ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ یہی وہ واحد اصطلاح ہے جس کو سیاسی ماحول کو سمجھنے کیلئے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔

لیکن میں یہاں یہ بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میری مراد ہرگز یہ نہیں ہے کہ سیاسی ماحول دراصل قدرتی ماحولیاتی نظام ہی ہے بلکہ میری مراد صرف سیاست کے میدان میں روزمرہ رونما ہونے والے کاموں تک ہی محدود ہے۔ یہ کام اچھے یا برے دونوں ہو سکتے ہیں۔

میں جب بھی کبھی ماحولیاتی نظام کے بارے میں سوچتا ہوں تو میرے ذہن میں سمندر کا ساحلی علاقہ ہی آتا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ میں ایک ایسے علاقے میں ہی پلا بڑا ہوں۔ حکومت، سکول اور دیگر اداروں کو بحری جہاز، لنگر اندازی کے مقام اور سمندری کنارے کے ساتھ واقع عمارتوں سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ اسی طرح شہریوں اور ان کے آپس کے تعلقات کو بھی کسی چھوٹے سے جزیرے پر رونما ہونے والے واقعات کے ساتھ جوڑا جا سکتا ہے۔

ماحولیاتی نظام کا نقشہ ایک ایسے سیاسی نظام کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے جو صرف انتخابات اور حکومتوں تک محدود نہیں ہوتا۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انتخابات اور اس کے نتیجے میں حکومتوں کا قیام جمہوری عمل کا ایک ضروری حصہ ہے اور ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ نقشہ شہریوں کے آپس کے تعلقات پر مبنی معاملات اور حکومتی معاملات کو الگ الگ پیش کرنے کا آسان ترین طریقہ ہے۔ ان معاملات کا موازنہ بالترتیب باقاعدہ سیاسی امور اور شہری سیاست سے بھی کیا جا سکتا ہے۔

حکومتی معاملات سے جڑے باقاعدہ سیاسی امور کے متعلق ہم پہلے ہی بہت کچھ جانتے ہیں اس لئے ہماری موجودہ بحث کا تعلق صرف اور صرف شہری سیاست یا شہریوں کے آپس کے معاملات تک ہی محدود ہے۔ تاہم شہریوں کے آپس کے معاملات کا حکومتی اداروں یا باقاعدہ سیاسی عمل سے تعلق ضرور موضوع کا حصہ بنے گا کیونکہ سیاسی ماحول کے دو ہی حصے ہیں اور ان کا آپس کا تعلق انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔

گو کہ مختلف ادارے جنہیں جہازوں یا لنگر اندازی کے مقام سے تشبیہ دی گئی ہے اپنا کام کرنے میں آزاد اور خودمختار ہیں مگر جزیرے پر رونما ہونے والے واقعات ان کو بھی متاثر کرتے ہیں۔اسی طرح یہ جہاز بھی ان لوگوں اور ان کے آپس تعلقات کو متاثر کرتے ہیں جنہیں جزیرے سے تشبیہ دی گئی ہے۔اس کو سمجھنے کیلئے سال 2010 کی مثال بھی پیش کی جاسکتی ہے جب سمندری ساحلی علاقے 'گلف کوسٹ' میں تیل نکالنے والی مشین میں خرابی پیدا ہونے کے سبب کئی ملین تیل ساحلی علاقوں میں آ گیا تھا اور قریبی علاقے پر رہنے والے لوگ بھی اس سے بُری طرح متاثر ہوئے تھے۔اسی طرح قدرتی حفاظتی باڑیں موجود نہ ہونے کے سبب سمندر میں آنے والے قطرینا نامی طوفان کے نتائج ساحلی علاقوں پر رہنے والوں نے بھی بھگتے تھے۔

'گیلے علاقے'۔۔۔نقصان دہ اور فائدہ مند

آج جب بھی کبھی سمندر میں تیل کا اخراج ہوتا ہے تو ہم لوگ سمندری حدود یا دلدلی علاقوں کی حفاظت کیلئے دوڑتے ہیں حالانکہ اس سے پہلے ہم اس علاقے کو نظرانداز کرتے رہے ہیں۔جس کے نتیجے میں ایسے علاقوں میں موجود جاندار ختم ہوتے چلے گئے۔اسی طرح ہم نے آسان سمندری راستوں کے حصول کیلئے چھوٹے چھوٹے جزیروں کو ختم کر دیا مگر اس کی وجہ سے سمندری طوفانوں کو بھی ہم تک پہنچنے کے آسان راستے ملتے گئے لیکن اس صورتحال سے ہمیں ان تمام چیزوں کی اہمیت بھی واضح ہوتی گئی۔

لیکن اس سب کے دوران میں یہ بات بھی نہیں بھولنا چاہتا کہ سمندری حدود کے واقع دلدلی علاقے بذات خود بھی خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔کیونکہ یہی وہ علاقے ہیں جہاں زہریلے سانپ پرورش پا سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایسی جگہوں پر مگرمچھ بھی ہو سکتے ہیں۔ان خطروں کو خودغرضی، لالچ اور تعصب جیسے منفی رویوں سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔میرا مطلب دراصل یہ ہے کہ نہ تو شہریوں کی طرف سے کئے جانے والے تمام کام مثبت ہو تے ہیں اور نہ ہی حکومتی ادارے ہمیشہ منفی کاموں میں ملوث ہوتے ہیں۔ان میں اچھائی اور برائی کے عناصر بیک وقت کارفرما ہوتے ہیں۔ بلکہ جمہوری نظام کے اکثر مسائل کے پیچھے موجود وجوہات تو دراصل منفی انسانی رویے ہی ہیں۔لیکن دوسری جانب معاشرے میں موجود تمام مسائل کا حل بھی انسانی رویوں میں ہی موجود ہے۔

لیکن جس طرح میں نے پہلے کہا کہ عین ممکن ہے کہ ہم دلدلی علاقوں کی اہمیت کو نظرانداز کر دیں۔ بالکل اسی طرح جیسے روزمرہ کے میل جول اور تجربات کو انتخابات کے مقابلے میں بالکل بے معنی سمجھا جاتا ہے۔عدالتی

کاموں اور قانون ساز اداروں کو اپنی ذاتی وابستگیوں سے سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ تاہم اس کے باوجود روز مرہ وقوع پذیر ہونے والے واقعات ہماری زندگی کے فیصلہ سازی کے عمل کو ضرور متاثر کرتے ہیں۔ روزانہ ہونے والی غیر اہم ملاقاتوں کے نتیجے میں ہی معاشرے میں ہمارے تعلقات بنتے ہیں اور یہی چیزیں آگے بڑھ کر سماجی تنظیم کی شکل اختیار کر سکتی ہیں۔

اس سلسلے میں معاشرتی زندگی میں نظر انداز کئے جانے والے پہلوؤں سے متعلق ان مثالوں پر بحث کی جا سکتی ہے جسے فاؤنڈیشن کے سامنے رکھا گیا۔ جیسا کہ اریِنیسٹو جو کہ ایسے ہسپانوی معاشرے میں رہتے تھے جس میں لوگوں کا اپنے اردگرد رہنے والے لوگوں سے کوئی خاص تعلق نہیں تھا۔ اس معاشرے کے لوگ غریب تھے اور بمشکل اپنا گزارہ کر پا رہے تھے۔ بیشتر لوگوں کے لئے انگریزی دوسری زبان کی حیثیت رکھتی تھی اور اس کی وجہ ان کا ایسے لوگوں سے تعلق تو قطعاً قائم نہیں ہو سکتا تھا جو صرف انگریزی ہی سمجھ سکتے تھے۔ یہ لوگ ووٹ کا حق بھی کم ہی استعمال کرتے تھے۔ احتجاجی سرگرمیوں میں بھی لوگوں کی کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی اور عام طور پر اگر ایسا ہی کچھ ہوتا بھی تھا تو صرف مقامی معاملات پر جو کہ خبروں کی زینت بھی نہ بن سکتی تھی۔

امریکی مزدوروں سے متعلق اعداد و شمار رکھنے والے ادارے نے سال 2012 میں اریِنیسٹو کے معاشرے سے متعلق رپورٹ دی کہ ہسپانوی لوگوں کی رضا کارانہ کام میں حصہ لینے کی شرح محض 15.2 فیصد تھی جبکہ اسی علاقے میں رہنے والے افریقی اور گورے باشندوں میں یہ شرح بالترتیب 21.1 فیصد اور 27.8 فیصد تھی۔

جب اریِنیسٹو کو یہ پتہ چلا کہ اس کی کمیونٹی سے متعلق یہ سمجھا جا رہا تھا کہ یہاں کے لوگ عام طور پر کم میل جول رکھنے والے لوگ ہیں وہ جانتا تھا کہ اصل صورتحال یہ نہیں ہے۔ وہ اس بات سے آگاہ تھا کہ کچھ ایسے لوگ جنہوں نے باقاعدہ رضا کار بننے سے تو انکار کیا تھا مگر پھر بھی وہ اپنے اردگرد کے لوگوں کی مدد ضرور کرتے تھے۔ لوگ آپس میں مل جل کر کچھ ایسے کام کر رہے تھے جس کا سارے معاشرے کو بحیثیت مجموعی فائدہ تھا۔ انہوں نے آپس میں مل کر ایک کمیونٹی گارڈن بنایا تھا جس میں لوگ پڑھتے تھے اور تقریبات منعقد کرتے تھے۔ وہ لوگ باقاعدہ اجتماعات کم منعقد کرتے تھے مگر اس کے باوجود خریداری کے دوران یا دیگر کام کرتے ہوئے سیاسی حالات پر بحث ضرور کرتے تھے۔ لیکن یہ وہی معاملات تھے جو ان کی ذاتی زندگی کو براہ راست متاثر کرتے تھے۔ جیسا کہ نوکریوں کی کمی وغیرہ یا بچوں کو پیش آنے والی مشکلات۔ لیکن اکثر لوگوں کو اس کمیونٹی کے اس پہلے کے بارے میں یا تو معلوم نہ تھا یا پھر انہوں نے ان معاملات کو نظر انداز کر رکھا تھا۔

خوش قسمتی سے آج ایسے ادارے قائم ہو چکے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ کچھ ایسے سماجی معاملات بھی ہوتے ہیں جن کو ماپا نہیں جا سکتا۔ مثال کے طور پر ایک ادارے کا سانے اریِنیسٹو کمیونٹی کے کچھ ایسے معاملات کی نشاندہی کی ہے مگر یہ ابھی باقاعدہ ریکارڈ کا حصہ نہی بن سکے۔

شہریوں کے آپس کے معاملات کا سیاست سے تعلق

اس باب کے آغاز میں شہریوں اوران کے آپس کے معاملات کو جزیرے یا دلدلی علاقوں سے تشبیہ دی گئی تھی۔اسی طرح ایرنیسٹو کو اپنے ماحول کے دلدلی علاقے میں ایسے کئی وسائل نظر آتے ہیں جن کا ابھی ابھی ذکر کیا گیا ہے۔دلدلی علاقوں میں ویسے تو سکون اور خاموشی ہے مگر ان میں زندگی بھی موجود ہوتی ہے۔ایسے علاقوں پر دھیان دے کر ان میں موجود خطرناک چیزوں کو باہر نکالنے کی ضرورت ہے تاکہ مثبت چیزیں بہتر پرورش پا سکیں۔ بالکل ایسے ہی معاشرے میں موجود منفی رویوں کو ختم کر کے بھی مثبت رجحانات کو پروان چڑھایا جانا چاہئے۔لوگوں روزمرہ کے معاملات جسے میں نے ابتداء سے شہری سیاست کا نام دیا ہے، میں روایتی سیاسی عمل سے قدرے مختلف مقاصد اور طریقہ کار استعمال کرتے ہیں۔یہی وہ سیاسی عمل ہے جس میں نہ صرف شہریوں کے آپس کے تعلقات بلکہ شہریوں کے ریاست کے ساتھ تعلقات ایک معاشرے کو تشکیل دیتے ہیں۔یہ تعلقات دوطرفہ ہوتے ہیں اور کچھ لو اور کچھ دو کی بنیاد پر استوار ہوتے ہیں۔اس کے باوجود شہریوں کے باہمی تعلقات خاندانوں یا دوستوں کے تعلقات سے مختلف ہوتے ہیں۔یہ تعلقات کچھ زیادہ حد تک عملی اور کام سے متعلقہ ہوتے ہیں۔یہ تعلقات ایسے ماحول میں تشکیل پاتے ہیں جس کا تذکرہ پہلے کیا جا چکا ہے۔مثال کے طور پر کسی قدرتی آفت کے بعد گھروں کی تعمیر نو کے عمل کے دوران ایسے باہمی تعلقات استوار ہو سکتے ہیں۔یا پھر بے گھر لوگوں کو رہائش کی فراہمی دینے یا مل جل کر پولیس کی مدد سے نوجوانوں کو محفوظ رکھنے جیسے کاموں کے دوران بھی ایسے حالات پیدا ہو سکتے ہیں۔

> **'جمہوریت انسانی فطرت میں شامل ہے، بالکل اسی طرح جیسے اجتماعیت بھی ہماری جبلت کا حصہ ہے اور اجتماعیت کا احساس ہمیں صرف اور صرف ایسے دوطرفہ تعلقات کے نتیجے میں ہی ملتا ہے جو لامتناہی حد تک پھیلے ہوئے ہوں'-- میری پارکر فولیٹ**

ماحول کے دلدلی علاقے جنہیں لوگوں سے تشبیہ دی گئی ہے، ہی وہ مقامات بھی ہیں جہاں وہ سوچ جنم لیتی ہے جو معاشرے میں موجود مسائل کا حل نکالتی ہے۔ایسے طریقہ کار سوچے جاتے ہیں جن سے لوگوں پر اثر انداز ہوا جا سکتا ہے۔لیکن انہی معاشروں کے ارگرد کئی دیگر معاشرے بھی موجود ہوتے ہیں۔جن میں سے کئی تو بیرونی دنیا سے بے نیاز ہوتے ہیں اور کچھ باہر سے آنے والوں کو کھلے دل سے خوش آمدید کہتے ہیں۔یہی تعلقات یہ طے کرتے ہیں کہ کونسے امور سرانجام دیئے جا سکتے ہیں اور کونسے کام کرنا ناممکن ہوگا۔اور پھر کوئی کام کرنے کے لئے کن مشکلات سے دوچار ہونا پڑے گا اس کا فیصلہ بھی معاشروں کے باہمی تعلقات کی نوعیت سے ہی کیا جا سکتا ہے۔اگر لوگوں کے آپس کے تعلقات بہتر ہوں گے تو یقیناً نقصانات کم ہونے کے مواقع زیادہ ہوں گے۔یہی

تعلقات فیصلہ سازی کے عمل پر بھی براہ راست اثر انداز ہوتے ہیں۔لوگ اپنے تجربات سے کتنا سیکھیں گے اور حالات کے بدلنے سے لوگ خود کتنا بدلیں گے اس کا اندازہ بھی لوگوں کے باہمی تعلقات ہی کیا جا سکتا ہے۔

ایسے سیاسی ماحول کی اپنی ایک مخصوص ساخت ہوتی ہے جس میں قانون ساز اسمبلیوں کی جگہ عام اجتماعات ہوتے ہیں جو پہلے کبھی ڈاکخانوں کے باہر موجود برآمدوں میں ہوتے تھے اور آج انٹرنیٹ پر ہوتے ہیں۔ان کو کنکریٹ کی بجائے ریت سے مناسبت دینا زیادہ بہتر نظر آتا ہے۔عارضی گروپس بنتے ہیں اور منصوبے کی تکمیل کے بعد ختم ہو جاتے ہیں۔پھر کسی نئے منصوبے کیلئے وہی یا کوئی نئے گروپس دوبارہ تشکیل پا جاتے ہیں۔

مجموعی طور پر شہری سیاست میں مشترکہ فائدے کے منصوبوں پر کام کیا جاتا ہے اور کسی بھی معاشرے کی مشکلوں کا مقابلہ کرنے کی سکت ہی اس عمل کا محور ہوتی ہے۔یہ کام باقاعدہ رضا کاری سے کچھ مختلف ہوتا ہے اور اس میں ذمہ داری صرف ووٹ ڈالنے اور ٹیکس دینے تک محدود نہیں رہتی۔ یہ خدمت حکومتی اداروں کے مشاورتی اجلاسوں میں شریک ہونے سے کہیں بڑھ کر ہے۔اس عمل میں شہری صرف مشاورت ہی نہیں منصوبوں پر عمل درآمد کا بھی حصہ بنتے ہیں۔

اس سارے عمل کو محدود پیمانے کی سیاست کہا جا سکتا ہے مگر یہ جمہوریت کا ایک ضروری حصہ ہے۔اس کا حصہ بننے والے گروہ عام طور پر چھوٹے ہوتے ہیں اور ان کا باہمی رویہ بے تکلفانہ ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے ان میں سے کوئی بڑے عہدے پر فائز نہ ہو مگر ان کی اصل طاقت ان کے خیالات ہوتے ہیں۔ یہ لوگ تخلیقی ہوتے ہیں، مسائل کا حل تلاش کرتے ہیں اور اجتماعی طور پر کام کر کے اپنے منصوبوں پر عمل کرتے ہیں۔سب سے بڑھ کر ایسے لوگ معاشرے میں امید کی کرن پیدا کرتے ہیں۔

'اس بات پر کبھی شک نہیں کرنا چاہئے کہ عقل اور پکی لگن رکھنے والے لوگ پوری دنیا کو بدل سکتے ہیں، یہی لوگ ہیں جو دنیا میں تبدیلی لاتے ہیں'-- مارگریٹ میڈ سے منسوب

سیاسی حالات کو ماحولیاتی نظام سے تشبیہ دینے کی وجہ یہ ہے کہ کیٹرنگ فاؤنڈیشن اپنی تحقیقات میں جو کچھ دیکھ رہی ہے وہ سیاست اور سول سوسائٹی سے کچھ بڑھ کر ہے مگر اس کے باوجود یہ سب باقاعدہ سیاست کی بجائے معاشرت سے جڑا ہوا ہے۔ یہ کسی صورت بھی کوئی تنقید نہیں ہے بلکہ تفریق قائم کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ ماحولیاتی نظام اور دلدلی جگہوں سے مناسبت یہ وہ دلچسپ حقیقت ہے جس کو ہمارے ادارے کی تحقیقات کے دوران دیکھا گیا ہے۔

اصلاحات کی آڑ میں سماجی تحریکوں پر قبضے کی کوشش

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ ہر معاشرے میں کسی کام کو کر گزرنے کی پوری استطاعت موجود ہوتی ہے مگر اس کے باوجود اسی معاشرے میں کچھ منفی رویے پنپ رہے ہوتے ہیں۔ حکومتی اداروں کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایسے مسائل کا حل نکالیں۔ اگر کوئی کمیونٹی اداروں کی طرف سے نظر انداز کر دی جائے تو اس میں ایسے منفی رویے مزید مضبوطی سے جڑیں پکڑتے جاتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شہری سیاست کسی حد تک حکومت سے بھی جڑی ہوتی ہے۔ تاہم جب حکومتی ادارے کسی معاشرے میں اصلاحات متعارف کروانے کی جانب راغب ہوتے ہیں تو وہ عام طور پر اس معاشرے میں بہتری کیلئے پہلے سے کوشاں لوگوں کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔

جو بھی حکومت کسی معاشرے میں کچھ اصلاحات کرنے کی کوشش کرتی ہے وہ دراصل اس کو اپنا آئینہ دار بنانے کی کوشش کر رہی ہوتی ہے۔ اس طرح بعض اوقات کچھ سنجیدہ اور نیک نیتی پر مبنی کوششوں کو نتیجہ بھی کچھ زیادہ بہتر نہیں نکلتا۔ مثال کے طور پر کسی معاشرے میں موجود عارضی تحریکوں کو جب باقاعدہ حیثیت دینے کی کوشش کئے جانے کی صورت میں اپنی اصلی خوبیاں گنوا سکتی ہیں۔ ہمسائیوں کی مدد کرنے والے گروہ شاید کسی خاص ضابطے کے پابند ہو جائیں اور اس صورت میں وہ اپنی افادیت ہی کھو دیں۔ کیونکہ ممکنہ طور پر انہیں کچھ ایسے لوگوں کی مدد کرنے کی ترغیب دی جا رہی ہو گی جنہیں وہ جانتے تک نہیں ہیں۔ ایسا کئی جگہوں پر ہو چکا ہے جہاں کہ مقامی حکومتوں نے کوشش کی ایسے لوگوں کو حکومت کے مالی معاملات میں مدد کیلئے استعمال کیا جائے۔ ایسے لوگ ایک لحاظ سے حکومتی اداروں کا حصہ ہی بنتے چلے گئے۔

غیر منظّم سماجی تحریکوں کو اصلاحات کے نام پر حکومتی قبضے میں لینے کی کوشش کے کئی مقامات پر ایسے نتائج بھی نکلے کہ کچھ مالی معاونت کرنے والے اداروں کو بھی احساس ہونے لگا کہ ان کی جانب سے دی جانے والی رقوم مناسب نتائج پیدا کرنے میں ناکام ہو رہی ہیں۔ جب اس ناکامی کی وجہ تلاش کرنے کی کوشش کی گئی تو کیٹرنگ فاؤنڈیشن کی تحقیقات میں یہ بات سامنے آئی کہ حکومتی اداروں اور عارضی سماجی تنظیموں میں اتنا ہی فرق ہے جتنا باقاعدہ مربع شکل اور ایک بے قاعدہ سے قطرے میں ہوتا ہے۔ اس فرق کو واضح کرنے کیلئے ان تشبیہات کا استعمال ہمارے ادارے کے ایک ریسرچر ایڈ گر کاہن نے اپنی تحقیق 'نو مور تھرو اوے پیپل' میں کیا ہے۔

انہوں نے ہسپتالوں، سکولوں، اور باقاعدہ رضا کاری پروگراموں کو مربع شکل سے تشبیہ دی جبکہ انہوں نے معاشرے میں بے قاعدہ تنظیموں اور عارضی گروہوں کو قطروں جیسا قرار دیا۔ وہ لکھتے ہیں 'قطروں میں طاقت اور لچک ہوتی ہے اور ان کا ایک دوسرے سے ایک رابطہ استوار کیا جا سکتا ہے۔ اس سے وہ وسائل دستیاب کئے جا سکتے ہیں جو کسی بھی معاشرے میں موجود مسائل کا حل نکالنے کیلئے درکار ہوتے ہیں۔ لیکن رقوم کا زیادہ تر حصہ باقاعدہ اداروں پر خرچ کیا جاتا ہے کیونکہ انہیں انتظامی امور پر گرفت حاصل ہوتی ہے۔ ایسے اداروں میں رقوم کو

خرچ کرنے کی منصوبہ بندی کی جاتی ہے، ان کا با قاعدہ ریکارڈ رکھا جاتا ہے۔ انہیں ٹیکسوں کی چھوٹ ہوتی ہے اور ان کے پاس سامان کی وافر ترسیل ہوتی ہے۔ مزید برآں ان کے پاس ماہرین کی بھی بھرمار ہوتی ہے۔'

'اس بات سے قطع نظر کہ یہ ادارے کتنے لوگوں تک پہنچنے اور مسائل حل کرنے کے وعدے کرتے ہیں یہ ادارے بنیادی مسائل کے پیچھے موجود وجوہات تک کبھی نہیں پہنچ پاتے۔ یہ اس مقام تک رسائی ہی حاصل نہیں کر پاتے جہاں سے مسائل کو حل کرنے کی طاقت کی فراہمی ہوتی ہے۔ ایک معاشرے میں ان مربعوں یعنی اداروں اور پانی کے قطروں یعنی عام لوگوں کی تنظیموں میں رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی گئی تو یہ امور بھی سامنے آئے کہ مالی معاملات کا کنٹرول تو دراصل داروں کے ہی پاس تھا۔ اس صورتحال میں ادارے اپنی مرضی کے مطابق انتہائی معمولی رقوم ہی عام لوگوں کے ہاتھ میں جانے دیتے تھے۔ اور وہ بھی اس طرح کہ کچھ مقامی لوگوں کو ان تنظیموں کے نمائندے مقرر کر دیا گیا یا پھر ان میں کچھ لوگوں کو با قاعدہ طور پر بھرتی کر لیا گیا۔ اس سب کے باوجود ادارے عام لوگوں کی طاقتوں کو بہتر انداز میں بروئے کار لانے میں ناکام رہے۔'

'ایسی صورتحال میں یہ قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا گیا کہ رقوم کا کم از کم کچھ حصہ تو براہ راست عام لوگوں کو دیا جائے تا کہ وہ پہلے ہی کہ طرح مسائل کا حل نکالنا شروع کریں۔ مگر جب ایسا کیا گیا تو ایک اور عجیب بات سامنے آئی کہ اب ان عارضی تنظیموں کو بھی سرکاری اداروں کی طرح ایک با قاعدہ ڈھانچے کی ضرورت تھی تا کہ ان کو رقوم جاری کی جا سکیں اور ان کو خرچ کرنے کا طریقہ کار وضع کیا جا سکے۔ یہ سب کرنے کیلئے لوگوں کو تکنیکی تربیت دینے کی ضرورت تھی اور اس کیلئے بڑے مالی وسائل درکار تھے۔ اس عمل کے دوران انتہائی نچلے درجے پر کام کرنے کی تنظیموں کو اپنے مقاصد وضع کرنا سکھایا گیا اور انہیں بتایا گیا کہ اپنے مشن سے جڑے رہنا کتنا ضروری امر تھا۔ ان تنظیموں کے اہم لوگوں کو با قاعدہ میٹنگز کرنے کے متعلق سکھایا گیا۔ ان کو سکھایا گیا کہ انہوں نے اپنے تنظیمی قوانین کس طرح تیار کرنا ہیں اور ان میں ترمیم کرنے کا کیا طریقہ کار ہوگا۔ پھر حکومتی سطح پھر ان تنظیموں کی بہتری کیلئے کچھ تبدیلیاں لانے کی ضرورت کا احساس ہوا۔ مگر اس سب کے دوران وہ عام لوگ ہرگز وہ نہیں رہے جو وہ اس با قاعدہ نظام کا حصہ بننے سے پہلے تھے۔ ان میں مسائل کو حل کرنے کی پہلے سی طاقت بھی نہیں رہی تھی۔ مختلف کاموں کی انجام دہی اور ان پر نظر رکھنے کے دوران اس انرجی کی جگہ ہی نہیں بنی تھی جو اس سے پہلے ان میں موجود تھی۔'

یہ تحقیق بظاہر ایک کہانی دکھائی دیتی ہے مگر اس میں سماجی گروہوں کو با قاعدہ شکل دے کر حکومتی قابو میں لانے کی کوششوں کا نتیجہ ضرور دیکھا جا سکتا ہے۔

اگر امریکی تاریخ پر نظر دوڑائی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دراصل لوگوں کی عارضی تنظیموں نے کئی با قاعدہ اداروں کی شکل اختیار کر لی نہ کہ پہلے سے موجود اداروں پر ایسی تنظیموں نے اپنا رنگ چڑھایا۔ ابتداء میں ایسی تنظیموں نے حکومت سے رجوع کیا کیونکہ انہیں کچھ کاموں کی انجام دہی میں مدد درکار تھی۔ اس پر حکومت نے ان

کے مسائل حل کرنے کیلئے بیوروکریسی کا ایک ایسا حصہ ترتیب دیا جس کی ذمہ داری اس تنظیم سے متعلقہ امور پر نظر رکھنا تھا۔ پھر اداروں کی جانب سے ان تنظیموں کو ہدایات بھی جاری کر دی گئیں۔ مگر اس سب کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان تنظیموں نے بھی باقاعدہ اداروں کی سی شکل اختیار کر لی۔ اگر ان تنظیموں کے اداروں پر اثرات کا جائزہ لیا جائے تو شاید سرکاری اداروں نے ان کا کوئی بھی اثر قبول نہیں کیا۔

غیر متوقع نتائج

سرکاری اداروں کے غیر منظّم سماجی تنظیموں پر بعض دفعہ کچھ ایسے اثرات بھی سامنے ہیں جیسا کہ انہیں ذمہ داری تو مزید لوگوں کو شامل کرنے کی دی گئی ہو مگر ان کی موجودگی میں پہلے سے شامل لوگ بھی رخصت ہونے لگیں۔ ادارے عام طور پر ایسی تنظیموں میں شامل ہونے کی مخصوص شرائط رکھتے ہیں اور پھر لوگوں کو کچھ کاموں کی انجام دہی کی باقاعدہ ہدایات بھی جاری کرتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں لوگوں کی کاموں میں دلچسپی کم ہونے لگتی ہے کیونکہ انہیں کہیں نہ کہیں یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ یہ کام دراصل ان کی مرضی سے نہیں ہو رہا اور یوں شمولیت کی شرح کم ہوتی جاتی ہے۔

اس سے برا نتیجہ شاید کچھ اسطرح نکل سکتا ہے کہ حکومتی سرپرستی کی وجہ لوگوں میں غصہ پیدا ہو جائے۔ ایک سکول کی انتظامیہ کی کوششیں اس وقت بالکل الٹ نتائج پیدا کرتی ہوئی نظر آئیں جب انہوں نے سکول بند کرنے کے فیصلے کو عام بحث کیلئے پیش کیا۔ اس معاملے پر کمیونٹی میٹنگز تو ہوئیں مگر اس پر انتظامیہ نے بعد ازاں خود ہی فیصلہ سنا ڈالا جس پر لوگوں میں اس احساس نے جنم لیا کہ انہیں استعمال کیا گیا ہے۔ نتیجتاً انتظامیہ اور مقامی لوگوں کے درمیان تعلقات کشیدہ صورت اختیار کر گئے۔

کسی سکول یا حکومتی ادارے کی حمایت میں چلائی جانے والی باقاعدہ مہم بھی منفی نتائج مرتب کر سکتی ہے۔ لوگوں کی حمایت حاصل کرنا ایک ضروری اور قابل تعریف عمل ہے۔ ایسی کسی بھی کوشش کا مقصد لوگوں کو ادارے کی اہمیت سے روشناس کروانا ہو سکتا ہے۔ مگر اس کے باوجود لوگوں اور اداروں میں رابطہ قائم کرنے کی کوشش میں لوگوں کے آپس کے تعلقات کی اہمیت نظر انداز کئے جانے کے امکانات ہیں۔ ایک بہترین مہم لوگوں کے باہمی تعلق کی غیر موجودگی میں انہیں کسی ادارے کی اہمیت سے متعلق آگاہ تو کر سکتی ہے مگر انہیں اس عمل میں شامل نہیں کر سکتی۔ جو کہ بہر حال اس ادارے کی اصل ضرورت ہوتی ہے۔

عارضی طور پر کام کرنے والی سماجی تنظیموں میں حکومتی مداخلت کے غیر متوقع نتائج کی ایک اور مثال ان کو بڑے پیمانے تک پھیلانے کوشش بھی ہے۔ اس صورتحال میں تنظیم کو جال پھیلانے کیلئے عموماً باقاعدہ ماہر عملے کی ضرورت ہوتی ہے اور ایسے لوگ بعد ازاں دوسرے لوگوں کو گمراہ کر سکتا ہے۔ اسی طرح کسی کامیاب منصوبے کی من وعن نقل بھی مضحکہ خیز نتائج پیدا کر سکتی ہے۔ خاص طور پر ایسے منصوبے جن میں مرکزی جدت کی نقل کرنے کی

بجائے پورے کے پورے طریقہ کار کی ہی نقل کر لی جائے۔

اس ضمن میں بدترین مثال اس اصلاح کی ہے جو لوگوں کے منصوبوں سے با مقصد ثمرات کے حصول میں ناکام رہے۔اس کی وجہ سے لوگوں میں عدم اعتماد پیدا ہونے لگتا ہے اور وہ سمجھنے لگتے ہیں وہ کچھ نہیں کر سکتے ہیں حالانکہ ان میں بہت سے کارنامے سرانجام دینے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔عام طور پر لوگوں سے سکولوں میں رضا کارانہ کام کرنے کی درخواست کی جاتی ہے۔تاہم اگر لوگ زیادہ عرصے تک ایسے کام میں شامل رہیں جو بظاہر بامقصد نہ ہو تو ان کی دلچسپی ختم ہونے لگتی ہے۔اپنی ایک تحقیق میں جان گویٹنا اور گریگوری بیریٹ نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ باقاعدہ سرکاری کام میں بظاہر لوگ کسی مثبت تبدیلی کا حصہ نہیں بن رہے ہوتے۔خاص طور پر ایسے کام میں جنہیں اکثر لوگوں کی حمایت حاصل نہیں ہوتی۔تاہم اس کے برعکس جب لوگوں کو ایسے کام میں شریک کیا جائے جس میں انہیں احساس ہو کہ وہ کوئی اہم کام سرانجام دے رہے ہیں تو انہیں حوصلہ ملتا ہے کہ وہ معاشرے میں کوئی تبدیلی لانے کیلئے کوشاں ہیں۔اس امر سے انہیں دلی اطمینان نصیب ہوتا ہے۔لوگ اپنی ہر کوشش کو کامیاب ہوتا دیکھنے کی توقع نہیں کرتے مگر وہ اس بات کے متمنی ضرور ہوتے ہیں کہ انہیں احساس ہو کہ کچھ نہ کچھ بہتری ضرور آرہی ہے۔

حکومتی مداخلت کی وجہ سے اس قدر منفی اور غیر متوقع نتائج کیوں سامنے آتے ہیں؟ کیونکہ یہ نتائج بہر حال انتہائی واضح ہیں۔حکومتی اداروں کو یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ جو وہ کر رہے ہیں سودمند ثابت نہیں ہو رہا۔مگر اس کے باوجود وہ وہی اقدامات اٹھانے پر بضد ہیں۔یہ امر ظاہر کرتا ہے کہ شاید ان حماقتوں کے پیچھے ان اداروں کے اندرونی حالات اور مفادات ہیں۔رچ ہارووڈ اور جان کریگھٹن کے ایک غیر سرکاری تنظیم کے کچھ لوگوں کے ساتھ ہونے والے مباحثے میں کچھ ایسے پہلو سامنے آئے جو ایسی تنظیموں اور سرکاری اداروں میں ہمیشہ ایک خلیج قائم رکھتے ہیں۔انہیں معلوم ہوا کہ منظّم غیر منافع بخش تنظیمیں عام طور پر ایک یونٹ کی طرح ماہرانہ انداز میں کام کرتی ہیں۔حالانکہ یہ منظّم ادارے معاشرے میں موجود غیر منظّم تنظیموں کے ساتھ نیک نیتی سے کام کرنا چاہتے ہیں مگر پھر بھی انہیں کئی ایک دشواریاں سر کرنا پڑتی ہیں۔اس دوران ان کے مقاصد میں اختلافات پیدا ہونے لگتے ہیں اور نتیجتاً یہ اپنے مفاد کو ترجیح دینے لگتے ہیں۔ایسی تنظیموں کے سربراہوں کے خیال میں ادارے کا استحکام سب سے ضروری ہوتا ہے۔اس کی وجہ سے ادارے کا بچاؤ ایک بنیادی مقصد بن جاتا ہے اور اس مقصد کے حصول کے بعد ہی کسی دوسرے مشن پر کام کیا جا سکتا ہے جیسا کہ معاشرے میں تبدیلی لانا یا مسائل مقامی لوگوں کی استعداد کار میں اضافہ کرنا۔

اسی تحقیق میں یہ بات بھی سامنے آئی کہ ایسی تنظیمیں جو ہر وقت اپنا بچاؤ کرنے میں ہی مصروف رہتی ہیں ان کے افسران اور دیگر عملہ کوئی بے باک قدم اٹھانے سے باز رہتا ہے اور نئے تجربات کرنے کی بجائے روایتی

طریقہ کار ہی اختیار کئے رکھتے ہیں۔ پھر ایسے اداروں میں عام لوگوں کو سب بڑا خطرہ سمجھا جانے لگتا ہے کیونکہ ان سے متعلق کوئی پیش گوئی نہیں کی جا سکتی اور یہی وہ مقام ہے جہاں سے جھگڑے پیدا ہو سکتے ہیں۔ اس ساری کوشش میں ہوسکتا ہے کہ وہ منصوبہ جس پر دونوں تنظیمیں کام کرنا چاہ رہی ہیں وہ ہی ختم کر دیا جائے یا اس کے کچھ منفی نتائج سامنے آجائیں۔

مزید یہ ہے کہ تحقیق میں جو غیر سرکاری منظّم تنظیمیں شامل ہوئیں ان میں سے بیشتر مالی معاملات کے حوالے سے حکومت یا کسی دوسری بڑی تنظیم پر انحصار کرتی تھیں۔ اس کی وجہ سے وہ عام طور پر وہی مقاصد رکھتی ہیں جو ان کی مالی مدد کرنے والے اداروں کے ایجنڈے میں بھی شامل ہوتے ہیں۔ یوں دراصل یہ تنظیمیں معاشرے کی بجائے ان بڑے مالیاتی اداروں کی خدمات سرانجام دے رہی ہوتی ہیں۔

کام جو تبدیلی کا باعث بنتے ہیں

حکومتی اداروں کی جانب سے سماجی تنظیموں کے کاموں میں مداخلت دراصل عام لوگوں اور باقاعدہ تنظیموں کے مابین موجود فرق کو نظر انداز کئے جانے کا عملی مظاہرہ ہے۔ کسی حد تک حکومت اور اس کے اداروں کیلئے یہ آسان بھی ہے۔ میں بھی اس فرق پر کوئی زیادہ روشنی نہیں ڈال سکتا کیونکہ یہ چھپے ہوئے ہیں یا کسی حد تک واضح بھی ہوتے ہیں۔

یہ فرق طاقت سے متعلق نظریات سے شروع ہوتا ہے۔ طاقت سے متعلق عام لوگوں کی سوچ اور اداروں کے نظریات میں فرق ہوتا ہے۔ میں نے پہلے بتایا کہ لوگوں کی طاقت کا سرچشمہ ان کے باہمی تعلقات اور عملی امور کی انجام دہی ہوتا ہے۔ ایک جمہوری نظام میں شہری اپنے آپ کو خود ہی مضبوط کرتے ہیں۔ ان کا یہ کام کوئی دوسرا آکر سرانجام نہیں دیتا۔ اگر جمہوری نظام میں شہریوں کو مناسب طاقت حاصل نہیں ہوگی تو از خود حکمرانی کا نظام کام ہی نہیں کر سکتا۔ ایسے ہی ایک چبھتا ہوا سوال 'سینٹر فار ڈیموکریسی اینڈ سٹیزن شپ' میں کام کرنے والے ہیری بیوٹ نے بھی کیا۔ انہوں نے یہ سوال لوگوں سے پوچھا کہ اگر آپ کو طاقت دی جا رہی ہے دراصل یہ طاقت کس کو دی جا رہی ہے؟ یہاں ان کی مراد جمہوری نظام ہی ہے جس کا محور عوام ہوتے ہیں۔

عام عقل بھی یہی کہتی ہے کہ معاشرے میں کچھ لوگوں کے پاس طاقت ہوتی ہے اور بعض لوگ طاقت کے حامل نہیں ہوتے۔ دوسری قسم کے لوگ یا تو خود کو بے بس سمجھتے ہیں یا پھر معاشرے کے دیگر لوگ ان کو بے بس تصور کرتے ہیں۔ یہیں سے یہ خیال جنم لیتا ہے کہ بے بس لوگوں کو طاقت وہی لوگ دے سکتے ہیں جو پہلے سے ہی طاقت کے مالک ہیں۔ تاہم حقیقی طاقت تو عوام کو صرف اسی وقت حاصل ہوتی ہے جب ان کے تجربات، وسائل اور ذہانت بحیثیت مجموعی کام کرتے ہیں۔

شہری اپنے معاشرے میں موجود مسائل اور ان کے حل کی ذمہ داری اٹھانے سے طاقتور ہوتے ہیں۔ اگر تمام لوگ آپس میں مل کر کوشش کریں گے تو معاشرے میں طاقت کا توازن قائم ہوگا اور پھر بے بس لوگ خود ہی ختم ہوتے جائیں گے جن کے پاس ازخود حکمرانی کیلئے طاقت موجود نہیں ہوتی۔ شہریوں کو چاہئے کہ وہ مثبت بحث کو غور سے سنیں اور اپنی معلومات میں اضافہ کریں تا کہ انہیں فیصلے کرنے اور ان پر عمل کرنے میں آسانی رہے کیونکہ بالآخر یہ کام انہیں خود ہی کرنا ہے۔ شہری عام طور پر اس کام کو آسانی سے اپنا لیتے ہیں جس میں انہوں نے خود حصہ لیا ہو بجائے اس کام کے جو کسی دوسرے نے ان کیلئے منتخب کیا ہو۔ کسی اور کے کئے گئے فیصلوں پر سر جھکانے سے مناسب سیاسی اثرات مرتب نہیں ہوتے اور بعض اوقات تو اس کی وجہ سے عام لوگوں کی سیاسی معاملات میں دلچسپی ہی ختم ہو جاتی ہے۔

اصل طاقت وہی ہے جو لوگوں میں دوسرے لوگوں کے ساتھ مل جل کر کام کرنے کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ اس کے برعکس ایک طاقت اداروں کے ہاتھ میں ہوتی ہے جس کا زیادہ تر انحصار حکومتی ذرائع پر ہوتا ہے۔ شہری عام طور پر اپنے سے متعلقہ طاقت کے استعمال میں ہی دلچسپی لیتے ہیں نہ کہ حکومتی اداروں سے جڑی کوئی طاقت کے۔ اداروں کی طاقت بھی اسی وقت زیادہ موثر ہوتی ہے جب انہیں عام شہریوں کی حمایت حاصل ہو۔

عام لوگ اپنے کام میں جڑے رہتے ہیں کیونکہ اس سے ہی ان کو طاقت میسر آتی ہے اور وہ اپنے مستقبل کو ترتیب دیتے ہیں۔ دراصل تو شہریوں اور حکومتی اداروں سے متعلقہ امور ایک ہی ہیں۔ اس بات سے قطع نظر کے ان امور کو کون سر انجام دیتا ہے سیاسی کاموں کا تعلق فیصلہ سازی، انتظام اور فیصلوں پر عمل درآمد سے ہی ہوتا ہے۔ لیکن یہ بات بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ لوگوں اور اداروں کے کام کرنے کے انداز میں بہت واضح فرق ہوتا ہے۔

شہری کام کیسے کرتے ہیں؟

شہریوں کی جانب سے مختلف کاموں کی انتہائی موثر طریقے سے انجام دہی کا عمل مسائل کی نشاندہی سے ہوتا ہے۔ اگرچہ ان مسائل کو لوگ کیا نام دیتے ہیں وہ اہمیت کے حامل نہیں ہوتے مگر یہ ان چیزوں سے متعلق ہوتے ہیں جنہیں لوگ بہت عزیز خیال کرتے ہیں۔ ایسی چیزوں سے متعلق جن سے لوگوں کی بڑی امیدیں وابستہ ہوتی ہیں اور بیک وقت وہ ان سے متعلق محتاط بھی ہوتے ہیں۔ ان مسائل کے نام بھی بعض اوقات بڑے بنیادی ہوتے ہیں اور انسانی وجود سے متعلق اشارہ دیتے ہیں۔ یہ نام عام طور پر مختلف خطروں سے چھٹکارے کے طریقہ کار پر بھی مبنی ہوتے ہیں۔ یہاں یہ بتانا بھی اہم ہے کہ یہ نام ان ناموں سے تو بالکل مختلف ہوتے ہیں جو ماہرین، سیاستدانوں، حکومت یا اس کے اداروں کی جانب سے استعمال کئے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر لوگ اپنے گھروں میں محفوظ رہنا چاہتے ہیں اور یہ احساس اعداد و شمار میں منتقل نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے یہ ان اعداد و شمار سے بھی

مختلف ہوتا ہے جوحکومت جرائم کو بیان کرنے کیلئے استعمال کرتی ہے۔ جب لوگ مسائل کوایسی چیزوں کے نام دیتے ہیں جنہیں وہ قیمتی سمجھتے ہیں تو وہ سیاست ہی کر رہے ہوتے ہیں حالانکہ وہ اس کو سیاست کا نام نہیں دیتے۔ ایسے بھی ان کیلئے نام دیا جانا زیادہ اہمیت کا حامل نہیں ہوتا۔ان کیلئے آپس میں جڑے رہنا کسی قدر زیادہ اہم ہوتا ہے۔

حکومتی اداروں اور عام لوگوں میں جس طرح مسائل کی نشاندہی کا طریقہ کار مختلف ہے بالکل اسی طرح ان مسائل کوحل کرنے کیلئے جانے والے فیصلوں کا انداز بھی مختلف ہی ہوتا ہے۔لوگ مسائل کے حل کیلئے موجود تمام مواقعوں کا بغور جائزہ لیتے ہیں اس کے بعدان کے نتائج کے بارے میں پیش گوئی کی بنیاد پر فیصلہ کیا جاتا ہے۔عام طور پر اسی آپشن کوترجیح دی جاتی ہے جس میں نقصان کا خدشہ کسی قدر کم ہو۔بظاہر سرکاری ادارے یا باقاعدہ تنظیمیں بھی اسی طرح فیصلے کرتے ہیں مگر بہرحال جن مواقعوں پرغور کیا جاتا ہے وہ مختلف ہی ہوتے ہیں۔ لوگ عام طور پر اہم فیصلے لیتے ہوئے ان چیزوں کو ذہن میں رکھتے ہیں جو انہیں عزیز ہوتی ہیں۔بالکل اسی طرح جس طرح ابھی سکیورٹی سے متعلق مثال دی گئی ہے۔اس کے مقابلے میں حکومت انہی مسائل کوسامنے رکھتی ہے جن کا بحثیت مجموعی معاشرے کوسامنا ہوتا ہے۔یہ فیصلے عام طور پر حقائق پرمبنی ہوتے ہیں۔جیسا کہ یہ غور کیا جاتا ہے کہ سماجی فوائد حاصل کرنے کی اہلیت سے متعلق عمر میں ایک یا دوسال کی کمی بیشی کر دی جائے تو کتنے پیسے بچائے جاسکیں گے۔

اسی طرح لوگ جن وسائل کے ذریعے مصیبتوں سے نمٹتے ہیں وہ بھی مکمل طور پرمختلف نوعیت کے ہوتے ہیں۔عام طور پر یہ وسائل وہی چیزیں ہوتی ہیں جوان کے اردگرد پہلے سے موجود ہوتی ہیں چاہے یہ معاشرے کے کسی غریب ترین طبقے میں ہی کیوں نہ موجود ہوں۔شہریوں کی طرف سے ڈالا جانے والا حصہ بھی قدرتی اور غیر عارضی قسم کا ہوتا ہے۔جیسا کہ بڑا عزم، مصمم ارادہ اور کام کرنے کی لگن۔یہ ان وسائل سے مکمل طور پرمختلف ہیں جو اداروں کی طرف سے بروئے کار لائے جاتے ہیں۔سرکاری وسائل مادی اور تکنیکی ہوتے ہیں۔

یقینی طور پرکسی بھی فیصلے پرخود بخود عمل درآمد نہیں ہو جاتا۔اسی وجہ سے اداروں میں منصوبہ بندی کی جاتی ہے کہ کیا کیا جائے گا۔مگر اس کے برعکس لوگ اس طرح کام نہیں کرتے۔اور نہ ہی وہ اس طرح پہلے سے ہی توقعات وابستہ کر کے کامیابی سے ہمکنار ہوسکتے ہیں۔شہریوں کی طرف سے پیش کیا جانے والا تعاون مختلف ہوتا ہے اور اجتماعیت سے ہی اس کی سمت متعین کی جاسکتی ہے۔اس کے مقابلے اداروں کی طرف سے اٹھائے جانے والے اقدامات ایک ہی سمت میں اٹھائے جاتے ہیں اور یہ کام کسی مرکزی طاقت کی طرف سے سرانجام دیئے جا رہے ہوتے ہیں۔

شہریوں کے طرف سے کئے جانے والے کاموں کیلئے درکار وسائل تو لوگوں کی طرف سے کئے گئے

وعدوں سے ہی دستیاب ہو جاتے ہیں۔مثال کے طور پر لوگ یہ تمام وسائل آپس میں یوں بانٹ لیتے ہیں کہ فلاں شخص یہ ذمہ داری پوری کرے گا اور فلاں بندہ یہ کام سرانجام دے گا۔ دوسری جانب ادارے اپنی قانونی حیثیت کو استعمال کرتے ہیں۔شہریوں کی طرف سے کئے جانے والے معاہدے گو کہ دیکھنے میں حقیقت سے دور لگتے ہیں مگر پھر بھی ان پر عمل کر لیا جاتا ہے۔کیونکہ وعدے کرنے پر لوگوں کو براہ راست اپنے معاشرے کے دباؤ کا سامنا ہوتا ہے۔اس صورتحال میں کسی معاشرے کا بڑا افرد ان کاموں کے نگران کے طور پر فرائض سرانجام سے رہا ہوتا ہے۔ اس کی وجہ سے اگر کوئی شخص اپنی ذمہ داری پوری کرنے میں ناکام رہے گا تو اس سے اس کے بارے میں بات ضرور کی جائے گی۔

ایک آخری فرق یہ بھی ہوسکتا ہے کہ لوگ عام طور پر فلاحی کاموں میں از خود حصہ دار بن رہے ہوتے ہیں۔یہ لوگ کام کرنے کے دوران سیکھتے ہیں اور نئے طریقہ کار بھی ایجاد کرتے ہیں۔اس کے مقابلے میں ادارے جو کہ عام طور پر حکومت سے متعلقہ ہی ہوتے ہیں وہ قانون سازی کرنے اور مالی معاملات سے نمٹنے میں مصروف رہتے ہیں۔

نتائج

شہریوں کا منصوبوں کو مکمل کرنے کا انداز اور ان کیلئے وسائل دستیاب کرنے کا عمل نہ صرف مختلف ہے بلکہ ان کا نتائج سے متعلق نقطہ نظر بھی سرکاری اداروں کے برعکس ہوتا ہے۔اس ضمن میں ہارووڈ کی تحقیق بھی ذہن میں رکھنی چاہیئے جس کے مطابق شہریوں کا آپس میں مل جل کر کام کرنا بھی ثمرات میں ہی شامل ہوتا ہے۔کیونکہ شہری سیاست کا یہی تو مقصد ہوتا ہے۔اسی طرح ایک معاشرے کے بڑے فرد نے بھی بتایا کہ 'اگر سب لوگ مل کر معاشرے کو بہتر بنانے کی کوشش کریں تو یقیناً وہ معاشرہ بہتر ہو جاتا ہے'۔

لوگوں کی جانب سے فلاحی کام کئے جانے کا سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہے کہ اس سے مضبوط معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔لوگوں میں باہمی تعاون کی فضا بنتی ہے اور ایسے لوگ آگے آتے ہیں جنہیں نہ صرف معاشرتی مسائل کا پوری طرح علم ہوتا ہے بلکہ وہ ان کے حل کیلئے کوشاں اور سنجیدہ بھی ہوتے ہیں۔اس سب کے دوران اجتماعی فوائد کو ترجیح دی جاتی ہے نہ کہ کسی خاص گروہ کے مفادات کو۔ایسی عارضی تنظیمیں علاقوں کی معاشی، سماجی اور جغرافیائی حدود میں اضافے کا باعث بھی بنتے ہیں۔معاشروں کے مابین نئے تعلقات ترتیب پاتے ہیں اور اس کے نتیجے میں باہمی تعاون کا درجہ بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔

مشی گن کے علاقے گرینڈ ریپڈز میں ایک ریٹائرڈ کاروباری شخصیت اور سکول کے منتظم نے مقامی طور پر کام کرنے والے تمیں تعلیمی اداروں میں باہمی رابطہ قائم کیا اور یوں ہر سال تین بڑے معاملات حل کرنا شروع کر دیئے۔مخصوص منصوبوں تک محدود رہنے کی بجائے ان کا مقصد اپنے نیٹ ورک کو وسعت دینا تھا۔اس نیٹ ورک

کی تشکیل بذات خود ایک بڑا کارنامہ تھا چاہے اس کو علاقے کے منظم منصوبوں کے طور پر فہرست میں شامل نہیں بھی کیا جا سکا ہو۔

'اگر ہمیں کچھ کرنا ہے تو ہمیں پہلے اپنے باہمی رابطے مضبوط کرنا ہوں گے'۔۔۔ایلا رامریز

ان سارے کاموں کے نتیجے میں ایسے لوگوں پر مشتمل معاشرہ تشکیل پاتا ہے جو اپنی روح میں جمہوری ہوتا ہے اور ان لوگوں کی حیثیت ووٹروں سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ یہ معاشرہ دوسرے تمام معاشروں سے بہتر ہوتا ہے۔ یہ ایسے لوگوں پر مشتمل ہوتا ہے جو پوری طرح جاگ رہے ہوتے ہیں اور کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ ڈالتے ہیں۔ ان لوگوں کو کسی مخصوص گروہ کے مزموم مقاصد کے حصول کیلیئے استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ یہ خاموش اکثریت کی صورت میں نہیں ہوتے بلکہ اس کچھ بڑھ کر ہوتے ہیں۔ یہ کوئی علاقائی تنظیم تو نہیں ہوتی مگر ایک معاشرتی تنظیم ضرور ہوتی ہے جو اپنے روزمرہ کے مسائل کو حل نکالنا بخوبی جانتی ہیں۔ ایک ایسا سیاسی گروہ بن جاتا ہے جو صرف اپنے ہمسائیوں اور دوستوں تک ہی محدود نہیں ہوتا۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو ذمہ دار ہوتے ہیں اور اپنے مسائل کی ذمہ داری بھی اٹھاتے ہیں۔

☆☆☆☆

حصہ دوم

شہری اور معاشرہ

باب چہارم

کیا واقعی عام لوگ حکمرانی کر سکتے ہیں؟

میں نے شہریوں کے گرد گھومنے والے جمہوری نظام کا ایک خاکہ تیار کیا ہے اور اس کے مطابق اس نظام کی اصل طاقت معاشرے میں موجود لوگوں کی بدولت ہی ہوتی ہے۔ مسائل کا حل معاشرے میں موجود وسائل میں ہی موجود ہوتا ہے مگر ان وسائل کی یا تو نشاندہی نہیں کی گئی ہوتی یا پھر انہیں جان بوجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ مگر انہی وسائل کو استعمال میں لا کر لوگ اپنے آپ کو مضبوط کر سکتے ہیں۔ ہاں مگر یہ سب کرنے کے دوران لوگوں کو کئی ایک مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ اس باب میں ہم کئی سال پرانے اس دعوے پر بھی بحث کریں گے کہ بیشتر شہریوں میں وہ سب کرنے کی اہلیت ہی نہیں ہوتی جن کی توقع جمہوری نظام ان سے کرتا ہے۔ یہی بات آج بھی کہی جاتی ہے اور اسے آسانی سے رد بھی نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اس دلیل کو رد کیا ہی نہیں جانا چاہئے۔ مگر میں یہاں لوگوں پر کی جانے والی تنقید کے ساتھ ساتھ اس سے متعلق مختلف لوگوں کے جوابات بھی پیش کروں گا۔

'ایک متوسط امریکی شہری تعلیم حاصل نہیں کرنا چاہتا، نہ ہی وہ اپنے دماغ کی مناسب نشو ونما کرنے میں دلچسپی رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ کوئی کام بھی نہیں کرنا چاہتا۔ اور یہ سب ایک اچھا شہری ہونے کے سبب ہی ہے۔' قلیم وہیٹکار

لوگوں کو حکمرانی کا حق کیوں نہیں؟

اس باب کا نام الیگزینڈر ہملٹن کے اس قول سے متعلق ہے جس میں ان کا کہنا ہے کہ 'یہاں لوگ حکمرانی کرتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے نمائندوں کے ذریعے اپنا ردعمل ظاہر کرتے ہیں۔' ہملٹن کو شاید لوگوں کی حکمرانی کرنے کی اہلیت سے متعلق شدید تحفظات تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے لوگوں کی حکمرانی کو محض ووٹ ڈال کر اپنا نمائندہ منتخب کرنے تک ہی محدود کر دیا۔ حالانکہ امریکیوں کی اکثریت انتخابی عمل سے کچھ بڑھ کر حکمرانی کرنا چاہتے ہیں۔ ہاں مگر اس عمل کے دوران انہیں کئی قسم کی تنقید کا سامنا کرنا پڑے گا۔ دراصل شہریوں سے متعلق ایسی باتیں افلاطون کے زمانے سے ہیں۔ یا پھر شاید اس سے پہلے کے زمانے سے لوگوں کو حکمرانی کیلئے نا اہل تصور کیا جاتا ہے۔ مشہور

صحافی والٹر لپمین کا امریکی عوام سے متعلق کہنا ہے کہ 'آزاد اور خود مختار عوام ہمارے سیاسی ماحول میں ایک خواب سے بڑھ کر کچھ نہیں۔' ان کی یہ دلیل ابھی بھی پیش کی جاتی ہے۔

امریکہ میں کالج کی سطح پر پڑھائی جانے والی ایک کتاب میں یہاں تک کہا گیا ہے کہ امریکی عوام کی اکثریت سیاست اور اس سے جڑے امور سے لاتعلق ہے اور انہیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔

'جمہوریت ایک ایسا نظام ہے جس میں عوام حکمرانی کرتے ہیں مگر جمہوریت کی بقا کی ذمہ داری اشرافیہ کے کندھوں پر ہوتی ہے۔ یہ شاید جمہوریت سے متعلق ایک مضحکہ خیز حقیقت ہے کہ اشرافیہ کو سمجھداری سے حکمرانی کرنے چاہئے تاکہ عام لوگوں کی حکمرانی کا یہ نظام قائم رہ سکے۔ اگر امریکی سیاسی جمہوری نظام قابل اور فعال عوام پر منحصر ہوتا یہ نظام کب کا لپیٹا جا چکا ہوتا۔ کیونکہ اکثر لوگوں کو تو اس نظام کے متعلق علم ہی نہیں اور باقیوں کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ امریکہ کے سیاسی نظام میں خوش قسمتی سے یہ خوبی پائی جاتی ہے کہ لوگوں کی اکثریت پیروی کرنے کو ترجیح دیتی بجائے اس کے کہ وہ قیادت کریں۔'

یہ تنقید صرف تعلیمی کتابوں تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ کئی اہم مقامی اور قومی لیڈر بھی یہی رائے رکھتے ہیں۔ انہی میں سے ایک کا تو یہ بھی کہنا تھا کہ 'یہاں تو جمہوریت کام ہی نہیں کر سکتی'۔

اسی طرح جان ہبنگ اور الزبیتھ تھیسز مورس نے اپنی رپورٹ 'سٹیلتھ ڈیموکریسی' میں کہا کہ عوام کی اکثریت چاہتی ہے کہ ان کی طرف سے چنے گئے لوگ ہی حساس معاملات پر ان کی جگہ فیصلے کریں۔ ان میں سے بہت کم لوگ ہیں جو جین، روتھ، سینڈی یا میکس کی طرح یہ معاملات اپنے ہاتھ میں لینا چاہتے ہیں۔ دوسری جانب کچھ لوگ اس دلیل پر اعتراض بھی کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ عام طور پر جس چیز کو عوام کی سیاست میں عدم دلچسپی قرار دیا جاتا ہے وہ دراصل موجودہ سیاسی نظام کی طرف عوامی ردعمل ہے۔ ایک ایسا نظام جو مکمل طور پر کھوکھلا ہو چکا ہے۔

اس سے اختلاف کرنے کیلئے شاید یہ دلیل پیش کی جا سکتی ہے کہ جمہوریت کو ہر وقت نئے چیلنجز کا سامنا کرتے رہنا چاہئے بجائے اس کے کہ یہ کہہ دیا جائے کہ لوگوں میں جمہوری نظام میں حکمرانی کا حق اپنے ہاتھوں میں لینے کی اہلیت ہی نہیں ہے۔ اس کیلئے ناقدین کی توجہ ان مسائل کی طرف دلائی جانا چاہئے جن سے متعلق فعال شہریوں کو بھی شدید پریشانیاں لاحق ہیں۔ ان مسائل میں لوگوں کو اچھا شہری بنانے سے متعلق پروگراموں میں پائی

جانے والی خامیاں شامل ہیں۔

لوگوں کی شمولیت اور سرکاری افسران کی پریشانی

لوگوں کومختلف منصوبوں میں شامل کرنے کی کئی ناکام کوششوں کے علاوہ سرکاری ملازمین نے اس عمل کے دوران اپنے لئے کئی پریشانیاں بھی نوٹ کیں۔ ملازمین کا کہنا ہے کہ لوگ سیاسی معاملات میں عدم دلچسپی ظاہر کرتے ہیں جس کی وجہ سے مفاد پرست کاروباری شخصیات سیاست سے جڑے ہوئے معاملات پر قابض ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی کہ لوگ ایک دوسرے پر اعتمادنہیں کرتے اور یہ معاملہ رنگ ونسل کی بنیاد پر زیادہ دیکھنے کوملتا ہے۔سرکاری افسران کے مطابق ایسے بہت مواقع ہیں جن پرشہری آپس میں مل جل کر کام کرسکیں۔اگرلوگ آپس میں کام کرنا شروع کربھی دیں تو کئی شکایات سامنے آنے لگتی ہیں۔لوگ جذباتی ہوتے ہیں اوران کی طرف سے کئے جانے والے فیصلے ناقص ہوتے ہیں۔مثال کےطور پرلوگ حکومتی مراعات میں کمی کئے بغیرٹیکسوں میں کمی کے خواہاں ہیں۔سرکاراس وقت شدیدکوفت کا سامنا کرتی ہیں جب لوگ انہیں یا سرکاری اداروں کوقابل بھروسہ نہیں سمجھتے۔

دیگر ناقدین کا کہنا ہے کہ ایسے بہت کم سیاسی مواقع ہوتے ہیں جہاں لوگ کوئی کردارادا کرسکتے ہیں۔ لوگوں کے پاس وسائل کی کمی ہوتی ہے اور وہ نظم وضبط سے عاری ہوتے ہیں جس کی وجہ ان کی طرف سے کی جانے والی کوششیں اکثر اوقات غیرموثر ہی رہتی ہیں۔ ہرکام کو اپنی مرضی سے کرنا چاہتا ہے جس کی وجہ سے کوئی بات بن ہی نہیں پاتی۔ بطور رضا کار کام کرنے والے لوگ قابل بھروسہ نہیں ہوتے اور نہ ہی ذمہ داری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔اور ایسا کوئی طریقہ بھی موجودنہیں جس کے ذریعے ان کو وہی کام کرنے پر مجبور کیا جاسکے جس کوانہوں نے وعدہ کررکھا ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ جب کوئی منصوبہ شروع ہوبھی جائے تو اکثر اوقات وہ مکمل ہونے سے پہلے ہی رک جاتا ہے۔ایسا بھی کوئی طریقہ نہیں کہ لوگوں کو بتایا جاسکے کہ ان کی سماجی خدمت کس قدر موثر رہی کیونکہ لوگ اکثر اوقات نتائج کو پرکھنے کیلئے غیر جانبدار ہونے پر بھی تیارنہیں ہوتے۔

اگرچہ یہ ساری تنقید غلط ہو پھر بھی یہ ایک حقیقت ہے کہ شہریوں میں باہمی تعاون کی فضا قائم کرنے میں کئی سال کا عرصہ لگتا ہے۔اوراکثر اس قسم کی کسی کوشش کا نتیجہ ویسا نہیں نکلتا جیسا حکومت یا مالی معاونت کرنے والے ادارے توقع کرتے ہیں۔

جہاں تک شہریوں سے متعلق ناخوشگوار تجربات کا تعلق ہے تو کئی سیاستدانوں سمیت کئی لوگوں کو اس پر سنجیدہ نوعیت کے اعتراضات ہیں۔کسی معاملے کوشہریوں پر چھوڑنا اوران کے کسی فیصلے پر انحصار کرنا شاید کسی حد تک خطرناک بھی ہے۔لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو تمام معاملات کے فیصلوں میں عوام کو شامل کرنے کے خواہاں ہیں کیونکہ ان کا ماننا ہے کہ یہی وہ طریقہ ہے جس سے لوگ زیادہ طاقتور بنائے جاسکتے ہیں۔

بڑے سرکاری دفاتر کے سربراہان بھی لوگوں کو گلوبل دنیا میں ایک حقیر چیز تصور کرتے ہیں۔ وہ لوگوں کے مابین ایسا کوئی تعلق نہیں دیکھتے جو ہارووڈ کی تحقیق میں شامل تھے۔ جن میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ لوگ اپنے مسائل حل کر کے قومی بہتری میں حصہ ڈال سکتے ہیں۔ جب مسائل میں لوگوں کو شامل کیا جائے تو یہ کسی دوسرے بڑے مسئلے کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے، ان لوگوں کا یہی ماننا ہے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ مسائل کیلئے درکار وسائل کسی بڑے شہر سے ہی آئیں گے۔ لوگ شاید ایک علاقائی تعاون سازی کے معاہدے پر بھی متفق ہو جائیں مگر ان کے ذہن میں علاقے کا تصور پندرہ میل سے زیادہ نہیں ہوتا۔

'دی بگ سارٹ' میں بل بشپ کا کہنا ہے کہ لوگ اپنے جیسی سوچ رکھنے والے لوگوں میں اس قدر گم ہو کر رہنا شروع ہو گئے ہیں کہ کسی دوسرے علاقے کے لوگوں کے ساتھ کام کرنا ویسے ہی ناممکن ہوتا جا رہا ہے۔ لوگ ہمیشہ اپنے جیسے لوگ تلاش کرتے رہتے ہیں اور یوں ان کا کمیونٹی کا تصور چھوٹے سے چھوٹا ہوتا جاتا ہے۔ یوں مختلف گروہ یکساں ذہنیت کے چھوٹے چھوٹے دائروں میں تقسیم در تقسیم ہوتے جا رہے ہیں۔

عوام کی نظر سے

میرے پاس ایسی کوئی وجہ نہیں کہ میں ان لیڈروں اور نمائندوں کی اس بات سے انکار کروں کہ انہیں لوگوں سے متعلق مایوسی ہوئی ہے۔ دوسری عوام کا یہ کہنا کہ انہیں تو سیاسی نظام سے نکال باہر کیا گیا ہے بھی درست ہی نظر آتی ہے۔ اداروں میں لوگوں کا کم ہوتا ہوا اعتماد ایک حقیقت ہے اور اس کی سب سے بڑی وجہ سکولوں، حکومتی اداروں اور بڑی غیر سرکاری تنظیموں کی طرف سے عوامی شکایات کے جواب میں دیا جانے والا غیر مناسب ردعمل ہے۔

جان کریگھٹن کی ایک تحقیق میں یہ بات سامنے آئی کہ اکثر لیڈروں کے بارے میں عوام کی رائے منفی ہوتی جا رہی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ 'سیاستدانوں اور بڑے بڑے سرکاری و نجی اداروں کے سربراہوں کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ انہیں عام امریکی شہری کو پیش آنے والی مشکلوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا، یہاں تک کہ ان کا ان مسائل سے کوئی واسطہ تک نہیں ہوتا۔' پیسے کو عام طور پر منفی انداز میں نہیں لیا جاتا لیکن یہ لالچ اور دوسروں کی بے قدری کا باعث ضرور بنتا ہے۔ اس دوران لوگوں کی یہ دلیل بھی سامنے آئی کہ معاشرے میں پیسے کے اثر رسوخ کو اس وقت تک کم نہیں کیا جا سکتا جب تک اشرافیہ کے پاس ایسے کسی بھی قانون یا اصلاح سے بچ نکلنے کا راستہ موجود ہے۔ موجودہ سیاسی نظام لوگوں سے متعلق لاتعلق ہو چکا ہے اور اس کے جواب میں عوام کی بڑی تعداد بھی ایسی ہی ہو چکی ہے۔ عوام اب پہلے سے زیادہ طاقت کا غلط استعمال کرنے لگے ہیں۔ باقی لوگ جو اس نظام سے مایوس ہو چکے ہیں مسائل کا حل نکالنے کیلئے اپنے آپ اور ان لوگوں پر بھروسہ کرتے ہیں جو ان کے خیال میں ابھی تک یقین کئے جانے کے قابل ہیں۔ یہی رجحان کسی حد تک مذہبی معاملات میں بھی پایا جاتا ہے۔

اداروں پر عوامی عدم اعتماد کوئی وقتی معاملہ نہیں ہے بلکہ پچھلے کئی عشروں سے یہی صورتحال چلتی آ رہی ہے۔نوے کی دہائی میں بھی ایک تحقیق میں یہی بات سامنے آئی تھی کہ عوام حکمرانی میں مناسب حصہ یا توجہ نہ دیئے جانے کی وجہ سے بعض شدید غصے میں مبتلا ہیں۔ان میں یہ رائے اثر پکڑ چکی تھی کہ موجودہ نظام جس میں عام شہری کی آمد کو ناممکن بنا دیا گیا، میں ووٹ کے ذریعے کوئی بھی تبدیلی لانا بظاہر ناممکن ہی ہے۔یہ بات بھی سامنے آئی کہ لوگ نہ صرف حکمرانوں اور سیاستدانوں سے مایوس ہو چکے ہیں بلکہ ان میں بے بسی کا عنصر بھی پیدا ہو رہا تھا۔انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ انہیں نظام سے نکال باہر کیا گیا ہے اور کسی حد تک ان میں سماجی ذمہ داریوں سے متعلق بھی یہی رائے پیدا ہوتی جا رہی تھی۔اس تحقیق میں یہ بات بھی نوٹ کی گئی کہ ذاتی معاملات میں مصروف لوگوں کے پاس سیاست کیلئے وقت ہی نہیں ہے، بھی کچھ زیادہ درست نہیں تھی۔اس تجربے کا حصہ بننے والی عوام میں سماجی ذمہ داریوں سے متعلق واضح سوچ پائی جاتی تھی۔وہ اپنے معاملات سے متعلق اس حد تک سنجیدہ تھے کہ بعض اوقات ان کی پریشانی شدید غصے کی شکل اختیار کر لیتی تھی۔انہیں خدشہ لاحق تھا کہ وہ اپنے بچوں صرف مسائل ہی وراثت میں دے کر جا رہے ہیں۔

لوگوں نے خود کو سیاست سے نکال باہر کئے جانے کو اس صورتحال سے تشبیہ دی کہ جیسے وہ کسی دن اپنے ہی گھر آئیں اور انہیں دروازے پر تالا لگا ہوا ملے۔اور گھر کے اندر کوئی اور ان کے کپڑے پہنے ہوئے موجود ہو اور ان کی چیزیں کھا پی رہا ہو۔پھر وہ لوگ یہ بھی جانتے تھے کہ انہیں کس نے باہر نکال کر گھر کو تالا لگا دیا تھا۔وہ اس صوتحال کا ذمہ دار سیاستدانوں، بڑے کاروباری طبقے، میڈیا اور طاقتور لوگوں کو سمجھتے تھے۔وہ اس سیاسی نظام کو ایک خاص ٹولے کی حکمرانی قرار دیتے، جس کو جمہوریت سے بدل دیا گیا تھا۔وہ سیاست کو بڑے لوگوں اور مفاد پرست ٹولے کا کھیل سمجھنے لگے۔عوام کو ایک ایسے کونے میں دھکیل دیا یا تھا جہاں سے وہ ساری صوتحال دیکھ تو سکتے تھے مگر کسی بھی ایسے فریق پر اثر انداز نہیں ہو سکتے تھے جو سیاسی کھیل کو کنٹرول کر رہا تھا۔نوے کی دہائی میں پائے جانے والے یہی خیالات آج بھی ہمارے دلوں میں موجود ہیں۔

نظام میں تبدیلی کی ضرورت: عوام سے جڑی ہوئی جمہوریت کا قیام

جیسا کہ آپ نے دیکھا کہ امریکی عوام کی ایک بڑی تعداد سماجی کاموں میں شامل ہے اور وہ ایک ایسے سیاسی عمل کا حصہ بھی ہیں جس کو وہ سیاست سمجھتے ہی نہیں ہیں۔اس کے برعکس کچھ تحقیقات میں یہ بات بھی سامنے آئی کہ لوگ سیاسی عمل اور سماجی کاموں سے بالکل لاتعلق ہیں۔ان میں سے کوئی بھی بات ٹھیک ہو مگر یہ بات واضح ہے کہ عوام کی سیاست میں شمولیت کے مواقع پہلے سے کم ہوتے جا رہے ہیں۔

دو تحقیق کاروں، میتھیو کرینسن اور بینجمن گنس برگ، نے ایک طویل ریسرچ کے بعد یہ چیز نوٹ کی کہ کس طرح لوگوں کو سیاسی نظام سے باہر کر کے ان کی ذاتی زندگیوں تک محدود کر دیا گیا ہے۔انہوں نے ایسے کئی

ایک طریقہ کاروں پر بحث کی ہے جن کے ذریعے شہریوں کو اس نہج پر پہنچایا گیا ہے۔

'اشرافیہ نے ووٹروں کو فعال کئے بغیر اپنے مقاصد حاصل کرنے کے کئی طریقے دریافت کر لئے ہیں۔ معاملات کو عوامی بحث میں لانے کی بجائے سیاسی مخالفین کو انتظامی امور میں شکست دینے کی کوشش کی جاتی ہے، انہیں ایسے معاملات میں الجھا دیا جاتا ہے جو کسی بھی پالیسی کو ان کے مخالفین کی پہنچ سے ہی دور کر دیتے ہیں۔ اسی معاملے کے دوران سیاسی جماعتوں کے حمایتی جو پہلے ان کے حق میں باہر نکلتے تھے، اب لاتعلق ہو کر سارا کھیل دیکھتے رہتے ہیں۔ کل کے اداکار آج کے تماشائی بن چکے ہیں اور شہریوں کی جگہ گاہکوں نے لے لی ہے۔'

بالکل اسی طرح جیسے اس تحقیق میں عوام کو گاہکوں سے تشبیہ دی گئی ہے اسی طرح موجودہ سیاست میں درحقیقت شہری وہ گاہک ہیں جنہوں نے دی گئی آپشنز میں سے جس قدر دل کرے سیاستدانوں، پالیسیوں اور حکومتی پروگراموں کا انتخاب کرنا ہے۔ جمہوریت میں بھی عوام کی ذاتی زندگی کی صورتحال پیدا کر دی گئی ہے جہاں ان کی اجتماعی طاقت کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اس کے برعکس طاقت ان مخصوص گروہوں سے حاصل کی جاتی ہے جو چند مفادات تک محدود ہوتے ہیں۔ دوسری جانب حکومتی کردار بھی مفادات رکھنے والے گروہوں سے مک مکا کرنے تک محدود ہو کر رہ چکا ہے۔

شہریوں کو نظر انداز کئے جانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ سماجی فعالیت کا باعث بننے والے ذرائع بھی تبدیل ہو چکے ہیں۔ جیسا کہ تھیڈا سکاکپل کی تحقیق میں یہ بات سامنے آئی کہ 'اتنی بڑی تعداد میں موجود امریکیوں کے پاس مشترکہ مفادات پر مل جل کر کام کرنے کے مواقع انتہائی کم ہوتے جا رہے ہیں۔' ایسی صورتحال پیدا ہونے کی وجہ یہ ہے واشنگٹن میں معاملات پر قابو پانے کیلئے کئی لابیاں کام کرتی چلی آ رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سال 1960 سے 1990 کے دوران عوامی مفادات کا تحفظ کرنے سے متعلق باقاعدہ اداروں کی تعداد چھ ہزار سے بڑھ کر 23 ہزار تک پہنچ گئی تھی۔

اسی عرصے کے دوران سماجی گروہوں کی خدوخال میں بھی بڑی تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ ان میں بیشتر نے لابیوں کا حصہ بننے کیلئے واشنگٹن کا رخ کیا تو کئی نے مستقل عملے کے ساتھ مخصوص تھنک ٹینکس اور سیاسی کمیٹیاں تشکیل دیں۔ باقی ممبران نے خود کو ڈونرز کا روپ دیا اور سماجی خدمت کیلئے رقوم مختص کرنے لگے۔ رضا کاروں کی جگہ مستقل عملے نے لے لی جو قانون سازی پر اثر انداز ہونے کیلئے میڈیا میں مہمات چلانے میں مصروف عمل ہو گئے۔ یہ سب کچھ اکثر اوقات مخصوص ایشوز تک ہی محدود رہنے لگا۔ اس سے سب اداروں کو تو شاید فائدہ ہوا ہو مگر

اس کی قیمت میں اجتماعیت اور معاشرت جیسے امور قربان کئے گئے جو کہ ایک مہنگا سودا تھا۔ کیونکہ کم ممبران رکھنے والے یہ ادارے معاشرے میں موجود خلیج کو کم کرنے میں کوئی بھی کردار ادا کرنے میں ناکام رہے۔

'امریکہ میں معاشرتی زندگی مخصوص معاملات کی وکالت اور انتظام سازی کی شکل اختیار کر چکی ہے جس میں مشترکہ مفادات اور اقدار کی بجائے مخصوص مقاصد حاصل کرنی کی کوشش کی جاتی ہے'۔۔۔تھیڈا اسکا کپل

لوگوں میں نہ صرف یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ عوامی اداروں میں ان کا اثر رسوخ کم کر دیا گیا بلکہ وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ یہ صورتحال کبھی بھی تبدیل نہیں ہو سکے گی۔ عوام کو یہ خدشہ بھی لاحق ہے کہ بڑے اداروں میں نہ تو اصلاحات متعارف کروائی جا سکتی ہیں اور نہ ہی یہ ادارے خود کو از خود بہتر بنا سکتے ہیں۔

سال 1960 سے 1990 کے دوران ایک مثبت پیشرفت یہ ضرور سامنے آئی کہ اس عرصے کے دوران اقلیتوں اور خواتین کی ایک بڑی تعداد سیاسی عمل میں داخل ہوئی جس کے نتیجے میں موجود سیاسی قیادت کسی حد تک آبادی کی بہتر نمائندگی کرتی ہے۔ یہ قدم از خود حکمرانی کے نظریے کیلئے بہتر بھی ہے۔ مگر اس کے باوجود طاقت کا ایک بڑا حصہ غیر منتخب شدہ اداروں مثلاً بیوروکریسی اور عدالتوں کو منتقل کر دیا گیا ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ بات کہ پالیسی سازی کے معاملات میں عوام کی طاقت کو نظر انداز کیا جانے لگا۔

امریکیوں کو صرف سرکاری اداروں سے لاتعلق کر دیئے جانے پر ہی گلہ نہیں ہے بلکہ انہیں ایسے شہریوں سے بھی کئی شکوے ہیں جو ان کے دوست یا رشتہ دار نہیں ہیں۔ انہیں اس بات کا یقین نہیں ہے کہ وہ ان اجنبیوں پر اعتبار کر سکتے ہیں یا نہیں۔ اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ کئی آگاہی مہمات کے باوجود کسی حد تک لوگوں نے بھی خود دیوار سے لگا کر اجتماعی کوششوں میں اپنا کردار محدود کر لیا ہے۔ تاہم قدرتی آفات کی صورت میں یہ بات درست نظر نہیں آتی۔ ایسی صورتحال میں لوگ فوراً اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ کچھ لوگوں کو اس محدود کردار کے سبب شرمندگی بھی ہے مگر انہیں دوسروں پر شک کے سوا کوئی دوسرا راستہ بھی دکھائی نہیں دیتا۔

'جمہوریت کے سبق بھی زندگی کے اسباق کی طرح ہی ہیں، جو تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور ہمیشہ مختلف و بے ترتیب ہوتے ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ مشکلات کے ادوار میں پرکھے جاتے ہیں'۔۔۔جمی کارٹر

☆☆☆☆

باب پنجم

عوام کو حق حکمرانی واپس دینا

ناقدین کی طرف کی جانے والی کڑی تنقید، عوام کے کام کرنے کے طریقہ کار پر شکوک وشبہات کے اظہار اور جمہوریت پر اٹھتے سوالات کے باوجود امریکی شہریوں کی ایک بڑی تعداد موجودہ صورتحال سے لاتعلق نہیں رہ سکتی اور کچھ نہ کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ان کے پاس ایسا کرنے کی کئی وجوہات ہیں۔

شہریت کا ایک جائزہ

لوگوں کو دیوار سے لگانے والوں کے دلائل دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ایک قسم کے دلائل وہ ہیں جو آئینی اور قانونی طور پر شہری خود مختاری پر سوال اٹھاتے ہیں۔ دوسری قسم کے دلائل کا تعلق عملی کام سے ہے۔ یہ دلائل ان کاموں پر تنقید کرتے ہیں جو معاشرے میں خرابیوں کو جنم دینے والے اور اداروں کو کھوکھلا کرنے والے عوامل کے جواب میں آنے والے عوامی ردعمل سے متعلق ہیں۔ یہ دونوں دلائل دراصل ایک ہی بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ کس طرح سماجی طاقت کے ذریعے آئینی طاقت اور ووٹ کی طاقت کو مزید با مقصد بنایا جا سکے۔

شہری خودمختاری کی منطق

ایلیئٹ رچرڈسن جو مختلف سرکاری عہدوں خاص طور پر چار دفعہ واشنگٹن میں بطور وزیر تعینات رہے، نے ایک بار کہا کہ ’اگرچہ عوام نے اپنی بہت ساری ذمہ داریاں اپنے بہترین مفاد میں اپنے منتخب نمائندوں کو ہاتھوں میں دے دیئے ہیں مگر پھر بھی اصل ذمہ داری ہمارے کاندھوں پر ہی رہتی ہے۔ہم اس سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتے، یہ ہم سے ہی جڑی رہے گی۔ہم اس کو بخوبی سرانجام دیں یا اس سے جان چھڑانا چاہیں، یہ ہمارے سروں پر موجود رہتی ہے۔‘ کچھ لوگ اس ناختم ہونے والی ذمہ داری کو شاید حکومتی اقدامات کے بارے میں مسلسل جاری رہنے والا ریفرنڈم قرار دیں۔شہریوں کے مطابق جمہوری نظام میں وہی وہ طاقت ہیں جو ووٹ ڈالتی ہے اور جس کی نمائندگی مطلوب ہوتی ہے مگر حکومتی ایوانوں اور سرکاری اداروں میں براجمان لوگوں کے مطابق عوام کی حیثیت کچھ مختلف ہوتی ہے۔یہی وہ جگہ ہے جہاں سے اس نہ ختم ہو جانے والی ذمہ داری کا آغاز ہو جاتا ہے۔

امریکہ جیسے بڑے اور کثیر الجہتی آبادہ والے ملک میں نمائندہ حکومت کے قیام کی ضرورت ہے۔لیکن اپنے نمائندے منتخب کرنے کے بعد شہریوں کی آئینی اور قانونی ذمہ داریاں ختم نہیں ہو جاتیں۔اگر لوگ خود کو مکمل

طور پر خودمختار اور ناختم ہونے والی ذمہ داری کا حق دار تصور کرتے ہیں انہیں اس سے بڑھ کر کیا کچھ کرنا ہوگا؟

یہ بات جاننے کیلئے کہ عوام کو دی جانے والی طاقت اصل ہے اور یہ محض دکھاوا نہیں ہے، عوام کو چاہیئے کہ اس خودمختاری اور طاقت کا استعمال کرنا شرع کر دیں۔ اس کیلئے وہ سماجی کاموں کا سہارا لے سکتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے میں نے پہلے کہا تھا کہ جب عوام آپس میں مل کر ایسے کام کرتے ہیں جو ان کی اجتماعی فائدے کیلئے ہوتے ہیں تو وہ طاقتور ہونے لگتے ہیں۔ یہی وہ طاقت ہے جو اصل خودمختاری کے حصول کیلئے ضروری ہوتی ہے۔

'کسی معاشرے میں نافذ العمل جمہوری نظام کی افادیت کا اندازہ وہاں کہ عوام کی طرف سے کئے جانے والے سماجی کاموں سے لگایا جاسکتا ہے'۔۔۔ الیکسز ڈی ٹا کو یلے سے منسوب

سماجی کام اور عوامی خودمختاری سے متعلق پیش کئے جانے والے اس مفروضے کو سمجھنے کیلئے بادشاہی کے نظام کی مثال بھی لی جاسکتی ہے۔ اس نظام میں بادشاہ عملی طور پر کام کرتا ہے۔ اگر وہ عملی طور پر کام کرنا چھوڑ دیں تو لمبے عرصے تک ان کی حکمرانی قائم نہیں رہتی۔ یہی وجہ ہے کہ ایک خومختار شہری کو بھی صرف حکومتی اقدامات سے فائدے اٹھانے تک محدود نہیں رہنا چاہیئے بلکہ اسے ان کاموں میں حصہ دار بننا چاہیئے۔ ایک خودمختار معاشرہ کسی دوسرے پر انحصار کرنے کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ اسے ایسے کام خود سے کرنا ہوتے ہیں جو سب کیلئے فائدہ منداور مفید ہوتے ہیں۔

لوگوں کی طرف سے کئے جانے والے کاموں کو عوامی کاموں کا نام بھی دیا جاسکتا ہے، ایسے کام جو عوام کی طرف سے عوام کیلئے ہی کئے جاتے ہیں۔ تاریخی طور پر یہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ شہریوں نے سکول، ہسپتال اور یہاں تک کہ عدالتیں بھی قائم کیں۔ موجودہ دور میں لوگوں کی باہمی کوششوں سے کئے جانے والے کاموں میں وہ باغ شامل ہیں جنہیں مختلف سرگرمیوں میں استعمال کئے جانے کی غرض سے بنایا جاتا ہے۔

تعمیری استعداد کار میں اضافہ کرنا

شہری خودمختاری کا مقدمہ آج دلائل سے نہیں بلکہ عملی کاموں سے لڑا جائے گا۔ شہری ایک لمبے عرصے سے ایسے اداروں اور تنظیموں کے وکیل رہے ہیں جو مخصوص مسائل کے حل کیلئے کام کریں۔ مگر اب شہریوں کی ایک نئی قسم وجود میں آرہی ہے جس کا فوکس معاشرے کی مجموعی فائدے پر ہے نہ مخصوص مسائل اور منصوبوں پر۔ یہ لوگ معاشرے میں موجود مسائل کے حل کیلئے شہریوں کی استعداد کار میں اضافے پر زور دیتے ہیں۔ کیٹرنگ فاؤنڈیشن نے بھی ابتداء میں قومی معاملات پر مجموعی رائے عامہ تشکیل دینے اور فیصلہ سازی کے مراحل میں مقامی لوگوں کی شمولیت کیلئے سیمینارز منعقد کروانے پر توجہ دی۔ اس دوران ہمیں بھی ایسے شہریوں کی بڑی تعداد ملی جنہوں نے

ایسے کاموں کی ترویج کیلئے فورمز کا آغاز کیا تھا۔

ہاروڈ یونیورسٹی کی طرف سی کی جانے والی ایک تحقیق میں استعداد کار بڑھانے والے لوگوں کو ایسے کاروباری لوگوں سے تشبیہ دی گئی جو مکمل طور پر صفر سے اپنے سفر کا آغاز کرتے ہیں اور کامیابی سے ہمکنار ہوتے ہیں۔ان کی حیثیت کو محض وکلاء سے کچھ بڑھا کر پیش کیا گیا۔اور شاید یہ لوگ ایسا کوئی نام دیئے جانے کے قابل بھی ہوتے ہیں کیونکہ یہ لوگ بغیر کسی کی مدد یا حمایت کے کام کا آغاز کرتے ہیں، جو کہ ایک اچھوتا کام ہے۔ سیاسی ماحول کے ماہرین کی طرح یہ لوگ بھی مقامی وسائل کو بروئے کار لاتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے آپ کو نئی جہتوں کو شروع کروانے اور پروان چڑھانے کیلئے درکار کرنٹ سمجھتے ہیں۔ جولوگوں کی کام کرنے اور نئے نئے خطرات مول لینے کی استعداد کو بڑھا دیتا ہے۔ یہ لوگ مخصوص منصوبوں اور مقامات تک محدود نہیں رہتے بلکہ یہ معاشرے کی بحیثیت مجموعی بہتری کیلئے کوشاں ہوتے ہیں۔اپنا یہ کردار ادا کرتے ہوئے ان کا دھیان ان وسائل پر ہوتا ہے جن کی مدد سے لوگوں میں عام مسائل کو از خود حل کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔

اسی ریسرچ میں یہ بات بھی سامنے آئی کہ یہ لوگ معاشرے میں موجود دوسری طاقتوں کے ساتھ مثبت اتحاد بنانے کے بھی ماہر ہوتے ہیں، جن کی مدد سے اجتماعی فیصلہ سازی کے نئے نئے رجحانات متعارف ہوتے جاتے ہیں۔ یہ لوگ خطروں سے کھیلنے والے لوگ ہوتے ہیں جو عملی کام کرنے اور معاشرے میں تبدیلیاں لانے کیلئے آسانیوں کی توقع نہیں کر رہے ہوتے۔ وہ تجربات کرتے ہیں۔اور لوگ توقع کے مطابق کسی بھی تنظیم سے باہر کام کرتے ہیں یا پھر الگ سے اپنی غیر منظم تنظیم تشکیل دیتے ہیں۔ یہ لوگ عملی تعلقات استوار کرنے کی طرف توجہ دیتے ہیں جس کے نتیجے میں مقامی لوگوں کی استعداد کار اور اہلیت میں اضافہ ہوتا ہے۔

سماجی فعالیت کا نظریہ بغیر وجہ کے وجود میں نہیں آیا۔لوگوں کو عملی طور پر فعال کرنا جیرالڈ ٹیلر کی 'انڈسٹریل ایریاز فاؤنڈیشن' نامی تنظیم جیسے اداروں کا قدیم مشن رہا ہے۔ٹیلر کے مطابق لوگوں میں باہمی تعلقات اور تعاون کی فضا بنانے کیلئے ان کے اختلافات کو مدنظر رکھنا ان کے مشترکہ مفادات پر غور کرنے سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔ کیونکہ لوگوں میں ایسے ماحول کے قائم کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ شہری آپس میں اس وقت بھی تعاون کریں جب ان کے مفادات میں اختلافات بھی ہوں۔ مفادات کہیں نہ کہیں مشترکہ ہی ہوتے ہیں، مختلف مفادات عام طور پر ایک دوسرے پر ہی انحصار کر رہے ہوتے ہیں اور یوں ان میں باہمی تعلق پیدا کیا جا سکتا ہے۔

اسی ادارے کی ایک دستاویز میں ایسا طریقہ کار بیان کیا گیا تھا جس کے ذریعے لوگوں میں عملی تعاون کی فضا قائم کی جا سکتی ہے۔اس کے مطابق جب بالٹی مور کی ایک تنظیم 'بلڈ' کے نمائندے کام کے سلسلے میں سینیٹر پال سار بانیز سے ملے تو وہ مسکرائے اور اپنی کاپی نکال کر پوچھا کہ وہ ان کی کیا مدد کر سکتے ہیں۔ان لوگوں نے سینیٹر کو بتایا کہ 'انہیں اس سے کوئی مدد درکار نہیں بلکہ وہ محض اس سے ملنے آئے ہیں تا کہ جان سکیں کہ وہ امریکی سینیٹ کے رکن

کیوں ہیں؟ ان کے مفادات کیا ہیں۔ کیونکہ عین ممکن ہے کہ ان کے مفادات اور تنظیم کے مقاصد میں کچھ چیزیں مشترکہ ہوں۔ اگر کچھ ایسا ہوا تو ممکن ہے کہ ان کے درمیان تعاون کا ایک دیرپا تعلق قائم ہو سکے'۔

لوگوں کے مابین عملی تعلقات تشکیل دینے کا مقصد آپس میں تعاون کے روایتی طریقہ کار کو تبدیل کرنا ہے، ایک ایسا تعلق استوار کرنا ہے جس میں انتشار اور عدم اعتماد کا نام و نشان تک نہ ہو۔ یہ تعلق ایسے مفادات کی بنیاد پر قائم کیا جاتا ہے جو بعض اوقات مختلف یا اختلافی نوعیت کے بھی ہو سکتے ہیں۔ اس کا مقصد یہ نہیں ہے لوگ آپس میں مل بیٹھیں اور باہمی طور پر ایک دوسرے کو سمجھنا شروع کر دیں۔ محض لوگوں کو ایک ساتھ جمع کر لینا ہی شاید ایک بڑی کامیابی ہے۔ لیکن جلد ہی لوگ صرف باتوں سے اکتانے لگتے ہیں اور مسائل کے حل کی توقع کرنے لگتے ہیں۔ اور یہی ایک کے عملی تعلق کا مقصد ہوتا ہے۔

لوگوں کی استعداد کار میں اضافے کیلئے کام کرنے والے تقریباً تمام ہی لوگ یہ کہتے ہیں کہ عوام لمبے عرصے سے حل طلب مسائل کے جلد سے جلد حل کی توقع کرنے لگتے ہیں۔ ایسے مسائل کا حل جو آسانی سے یا فوری طور پر کسی صورت حل نہیں کئے جا سکتے ہوتے۔ انہی میں سے ایک نے مجھے بتایا کہ جو لوگ بنیادہ مسائل کے قلیل المدتی اور طویل المدتی حل کی باتیں کرتے ہیں وہ بڑی غلطی پر ہوتے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ بنیادی مسائل کیلئے کوئی قلیل المدتی حل نہیں ہوتے بلکہ طویل المدتی حل کیلئے ہی کام کرنا پڑتا ہے۔

ان لوگوں کے بارے میں یہ رائے بھی بالکل درست ہے کہ یہ عوام سے متعلق منفی باتوں پر کم ہی توجہ دیتے ہیں۔ جہاں انہیں ایک طرف ہر منصوبوں کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کیلئے خود موجود رہنا ہوتا ہے وہیں انہیں اس بات کا بھی خدشہ ہوتا ہے کہ کہیں اس صورت لوگوں میں ان پر انحصار کرنے کی عادت نہ پیدا ہو جائے۔ استعداد کار میں اضافے کیلئے کوشش کرنے والوں کو ایسے مسائل کا ہمیشہ ہی سامنا رہتا ہے۔ وہ مایوس کن صورتحال کا مقابلہ کرتے ہیں اور ڈوب کر ابھرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں۔ کیونکہ وہ مقامی وسائل پر انحصار کر رہے ہوتے ہیں لہذا ان کا سفر ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ کسی بھی مسئلے کے جواب میں ان کا پہلا ردعمل یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ پیسوں کا انتظام کہاں سے ہوگا؟ کیونکہ وہ جانتے ہیں کچھ چیزیں ہیں جن کو پیسوں کی جگہ استعمال کیا جا سکتا ہے مثلاً وقت، نیک نیتی، مقامی تعاون اور دیگر علاقائی وسائل۔

شہری خودمختاری کا سفر

سماجی کام کرنے والی طاقتیں بہت ہی چھوٹے کاموں سے آغاز کرتے ہیں۔ کسی دن کو ایک شخص پہلا قدم اٹھاتا ہے، جو کسی حادثے سے متعلق بات کرتے ہوئے اپنے دوست یا کسی رشتہ دار کو اپنے ساتھ شامل کرتا ہے۔ اس کے بعد بات ان کے اندرانی دائرے سے باہر نکلتی ہے اور ان لوگوں کے ساتھ رابطہ استوار کیا جاتا ہے جو ان مسائل سے متعلق ان کے جیسی رائے ہی رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک عورت اپنی ہمسائی سے گلی میں پڑے

ہوئے کسی نشے کے عادی شخص سے متعلق بات کرتی ہے۔ابتداء میں یہ بات ان کے گھر کے صحن میں ہوتی ہے جہاں سے یہ گرجا گھروں اور کمیونٹی سینٹرز کا رخ کرتی ہے۔سماجی تنظیموں میں اس پر بحث کی جاتی ہے اور نتیجتاً منشیات کو معاشرے سے دور رکھنے کی باتوں کا آغاز ہوتا ہے۔یہ لوگ کچھ ایسے اقدامات پر متفق ہوتے ہیں جو مقامی طور پر غیر منظّم گروہ سرانجام دیتے ہیں۔اس کے بعد کچھ ایسے کاموں پر بھی غور کیا جاتا ہے جن کا تعلق مقامی حکومت یا کسی ادارے سے ہوتا ہے۔

ایسے کاموں کا حصہ بننے والے لوگ انتہائی ذاتی سطح سے آغاز کرتے ہیں۔امریکی شہری اپنی نوکریوں، صحت اور بچوں کی تعلیم کے حوالے سے پریشان ہوتے ہیں۔وہ بار بار ایسے بنیادی مسائل کا سامنا کرتے رہتے ہیں جن کا تعلق کسی نہ کسی طرح سیاست سے ضرور ہوتا ہے۔ لوگوں کو جب بھی کسی مسئلے سے متعلق بتایا جاتا ہے وہ پہلے یہی سوچتے ہیں کہ کیا یہ مسئلہ انہیں یا ان کے کسی رشتہ دار یا دوست کو بھی درپیش ہے یا نہیں؟ ان کا دھیان اسی چیز کی طرف جاتا ہے جو انہیں سب سے زیادہ عزیز ہوتی ہے۔

ہم اپنی مثال کی طرف واپس آتے ہیں، کسی کو گلی میں پڑے ہوئے نشے کے عادی فرد کا علم ہوا ہے اور اسی بات کو لے کر پریشانی لاحق ہوگئی ہے۔وہ اپنی پریشانی کا ذکر کسی دوسری فرد سے کرتا ہے اور بات ایسے مقامات تک جا پہنچتی ہے جہاں لوگ روزمرہ معاملات پر بحث کرتے ہیں۔یہاں تک بحث کی کوئی خاص شکل وصورت ترتیب نہیں پاسکی ہوتی۔جو لوگ بھی اس گفتگو کا حصہ بن رہے ہوتے ہیں وہ اس میں اپنے ذاتی مشاہدات اور تجربات شامل کرتے جارہے ہوتے ہیں۔وہ دوسروں کا ردعمل جاننے کیلئے کچھ ایسے سوالات کرتے ہیں، آپ کیا دیکھا؟ یا آپ کا اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟، مجھے اس مسئلے کی وجہ سے پریشانی ہے کیا آپ کو بھی ہے؟۔اس موقع پر لوگ کوئی بھی فیصلہ نہیں کرنا چاہتے ہوتے اور وہ صرف صورتحال جائزہ لینے کی کوشش میں مصروف نظر آتے ہیں۔

جب لوگ زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرلیتے ہیں تو اکثر اوقات وہ ہیجانی کیفیت کا شکار ہوجاتے ہیں۔وہ مختلف آراء اور مسائل کی بھنور میں دھنستے چلے جاتے ہیں۔مگر ضروری نہیں کہ ہر دفعہ کچھ ایسا ہی ہو۔اس صورتحال میں لوگ مسائل کے مابین تعلق قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔انہیں روزمرہ کے کئی مسائل میں کئی قدریں مشترک دکھائی دینے لگتی ہیں۔یوں وہ جائزہ لینے لگتے ہیں کہ بالکل مختلف چیزیں کس طرح آپس میں جڑی ہوئی ہوتی ہیں۔مثال کے طور پر جب معاشرے میں نشے کی عادت بڑھنے لگتی ہے تو لوگ معیشت سے لے کر خاندانی استحکام تک جیسے معاملات پر غور کرتے ہیں۔وہ معاملات کو سادہ نظر سے نہیں دیکھتے بلکہ ان چیزوں کے مابین تعلق پر غور کرتے ہیں۔

جب لوگوں کو یہ احساس ہوتا ہے کہ ان کے تحفظات مشترک ہیں تو وہ ایک دوسرے کو باہم جڑا تصور کرنے لگتے ہیں۔مگر اس صورت حال میں انہیں مسائل کو ایک ہی طریقے سے دیکھنے کی ہرگز ضرورت نہیں۔لوگ

بہت کم ایک جیسا سوچتے ہیں کیونکہ ان کی زندگیاں مختلف ہوتی ہیں انہیں مختلف حالات کا سامنا ہوتا ہے اور انکی مجبوریاں بھی ایک جیسی نہیں ہوتیں۔اس کے باوجود جب کبھی لوگوں کو محسوس ہو کہ ان کے مسائل مشترکہ ہیں یا کوئی مسئلہ ان سب کو متاثر کر رہا ہے تو وہ کئی اختلافات کے باوجود آپس میں تعاون پر تیار ہو جاتے ہیں۔لوگوں کو یہ احساس ہوتا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ ان کے مفادات مختلف ہوں مگر وہ ایک دوسرے پر انحصار ضرور کرتے ہیں۔اس کے برعکس جب لوگوں کو آپس میں تعلق کا احساس نہیں ہوتا تو وہ مسائل کا سامنا کرتے ہوئے خود کو اکیلا تصور کرتے ہیں اور معاشرے میں کوئی تبدیلی لانے کے کسی بھی عمل کا حصہ نہیں بن پاتے۔

ایک ہزار لوگ مزید ایک ہزار لوگوں کو جگا سکتے ہیں

ہم لوگوں میں استعداد کار کا اضافہ کرنے والوں کی تلاش کیوں کر رہے ہیں؟ موجودہ مسائل اور جمہوریت سے متعلق تحفظات کے باوجود امریکیوں کی اکثریت یہ کیوں خودمختاری اور از خود حکمرانی کرنا چاہتی ہے؟ تاریخ ہمیں ان سوالات کے جوابات جاننے کیلئے مدد فراہم کرتی ہے۔

رابرٹ وائب بتاتے ہیں کہ کس طرح امریکہ کی سرحدی ریاستوں میں اشرافیہ کی رائے کے خلاف شہریوں نے ریپبلک بننے کی بجائے جمہوری نظام کے قیام پر زور دیا۔ یہ شہری جمہوریت کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ وائب لکھتے ہیں کہ انیسویں صدی میں تحریک کو جان دینے والی طاقت دراصل یہ بات تھی کہ فعال کردار ادا کرنے والے ہزار لوگ مزید ایک ہزار لوگوں کو جگا کر تحریک کا حصہ بنا رہے تھے۔وائب نے یہ بات انتخابات کو ذہن میں رکھ کر کہی ہے مگر میرے مطابق ان کی بات سماجی کوششوں پر بھی اسی طرح لاگو ہوتی ہے۔جمہوریت اور از خود حکمرانی کی روح مشترکہ فیصلہ سازی اور عملی جدوجہد کیلئے اجتماعی کوششوں میں ہے۔امریکہ کی سرحدی ریاستوں میں آباد ہونے والے لوگوں کے پاس نظام میں حصہ دار بننے کے سوا کوئی اور گنجائش نہ تھی،انہیں ان طاقتوں کا حصہ بننا تھا کو سڑکیں بنا رہیں تھیں اور قلعے تعمیر کر رہیں تھیں۔انہوں نے غریبوں کی مدد کرنے اور شراب نوشی کے خلاف مشترکہ تنظیم سازی کی۔یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے اپنی مدد آپ کے تحت سکول بھی قائم کئے۔

مل جل کر کام کرنے کی عادت آج بھی امریکیوں میں موجود ہے۔حال ہی میں ماحول کے تحفظ اور اقلیتوں کے حقوق کے لئے جو تحریکیں برپا ہوئیں یہ شہریوں کی جانب سے ہی شروع کی گئی تھیں۔اجتماعیت امریکی معاشرے کا خاصہ ہے جس میں انفرادیت کو بھی ایک مناسب مقام حاصل ہے۔اسی کی ایک صورت خود انحصاری بھی ہے۔اور شاید انفرادی ذمہ داری اور سماجی داریاں ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔

'سماجی کام میں مل کر کام کرنے والے جمہوری شہری اس نظام کو انفرادیت کا ایک بہترین مظہر بھی بناتے ہیں۔کیونکہ یہ لوگ یکساں نوعیت کے لوگ نہیں ہوتے بلکہ اپنے ذاتی خیالات اور تجربات

بیان کرتے ہیں۔ وہ یہ سب دوسروں کے فوائد کو مدنظر رکھے بغیر بیان کرتے ہیں۔ عام طور پر جو عمومی خیال ہوتا ہے وہی اکثریت کی رائے ہوتی ہے۔'

کیا ہے جو صرف شہری ہی کر سکتے ہیں؟

عوام کو واپس انہی کاموں میں لگانے کیلئے جو دراصل انہیں ہی کرنے ہیں، میں یہ بات نہیں بھولنا چاہتا کہ شہری ہی جمہوری حقوق کے بارے میں آگاہی پھیلانے کا سب سے بہترین ذریعہ بن سکتے ہیں۔ شہری جمہوریت کا سب سے بڑا مقصد بھی شاید ایسے لوگ تیار کرنا ہی ہے کو معاشرے کی قیادت کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ ایسے لوگوں کو ذاتی خوشی اور اطمینان اسی صورت حاصل ہوتا ہے جب عوامی منصوبے تکمیل کی طرف سفر کر رہے ہوں۔ دراصل انہیں سماجی کاموں میں حصہ دار بن کر ہی تسلی ملتی ہے۔ ایسا جمہوری معاشرہ قائم کرنا انتہائی مشکل کام ہے مگر ان حقوق کے حصول کیلئے سفر جاری رکھنے کو ہی جمہوریت کہتے ہیں۔

یہاں بحث کا مرکزی موضوع یہ نہیں ہے کہ عوام شہری حقوق کے فروغ کیلئے کیا کام کر سکتے ہیں، بلکہ ہمارا موضوع وہ وجوہات ہیں جن کے سبب لوگوں کو دیوار سے لگے رہنے کی بجائے میدان عمل میں اترنا چاہئے۔ الینر اوسٹرم نے اپنی تحقیق 'دی وٹنس سٹینڈ' میں یہی دلیل پیش کی تھی کہ لوگوں کی مدد نہ تو معاشرے ترقی کر سکتے ہیں اور نہ سرکاری ادارے اپنے کام موثر طریقے سے سرانجام دے سکتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسائل میں بیشتر لوگوں کی طرف سے مناسب وسائل کی فراہمی کے بغیر حل ہی نہیں ہو سکتے۔ یہاں تک کہ ہمارے سب سے بڑے اور بہترین ادارے بھی لوگوں کی مدد کے بغیر اپنی ذمہ داریاں پوری نہیں کر پاتے۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب ادارے اپنے بہترین ماہرین کی بجائے عوام کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

شرارت نما مسائل سے نمٹنا

سب سے مشکل مسائل کو شرارتوں سے تشبیہ دیا جانا زیادہ مناسب ہوتا ہے بجائے اس کے کہ ان مسائل کو خطرات کا نام دیا جائے۔ خطرات کے حل عام طور پر تکنیکی نوعیت کے ہوتے ہیں جبکہ ان مسائل کے ل ذرا مشکل ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر خوشحالی کے باوجود معاشرے میں موجود رہنے والی غربت کو ایسے مسائل میں سے ایک قرار دیا جا سکتا ہے۔

ایسے مسائل کی مخصوص نشانیاں ہوتی ہیں۔ جیسا کہ کچھ مسائل کے حل کو لے کر لوگوں میں اختلاف رائے ہوتا ہے۔ یہ اختلاف عموماً اخلاقی یا مذہبی سطح پر ہوتا ہے۔ لوگ وقوع پذیر ہونے والی مشکلات کو مانتے ہیں اور ان کیلئے مجوزہ حل بھی سنتے ہیں مگر پھر بھی وہ مسائل کی نوعیت کے بارے میں اختلاف کرتے ہیں اور ان سے نمٹنے کیلئے تجویز کئے جانے والے حل سے متعلق بھی تذبذب کا شکار ہوتے ہیں۔ مسائل سے متعلق کسی سوام پر کوئی اختلاف

موجود نہیں ہوتا مگر پھر بھی جوابات دینے سے پہلے لوگوں کو اچھی طرح سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔ ایسے معاملات میں لوگوں کی فیصلہ سازی کی صلاحیت ایک سنجیدہ معاملہ ہے۔ کیونکہ لوگ کسی طور پر صحیح اور غلط میں فرق کرنے کے ماہر نہیں ہوتے۔

اسطرح کے مسائل کی ایک اور نشانی یہ ہے کہ ان سے متعلق لوگوں کو کھل کر اظہار کرنا چاہیئے۔ لوگوں مسائل کے حل کیلئے ردعمل دینا چاہیئے کیونکہ ان کے پاس دیگر اداروں سے کہیں بہتر وسائل موجود ہوتے ہیں۔ کم از کم ان وسائل کی نوعیت ضرور مختلف ہوتی ہے۔ یہ وسائل ذاتی صلاحیتوں اور تجربات کی شکل میں ہو سکتے ہیں یا پھر اجتماعی احساسات اور عملی تعلقات بھی اسی فہرست میں شامل کئے جا سکتے ہیں۔ شہری ایسے مسائل کے حل کیلئے درکار سماجی طاقت بھی مہیا کرتے ہیں۔ مختصراً شہریوں کو ایسے مسائل سے نمٹنے کیلئے آپس میں مل کر بحیثیت مجموعی کام کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

اس قسم کے مسائل ہمارے سماجی نظام کی جڑوں میں موجود ہوتے ہیں اور کبھی بھی پوری طرح ختم نہیں کئے جا سکتے۔ یہ جتنے پرانے ہیں اسی قدر دیرپا بھی ہوتے ہیں۔ ان کی علامت کو ختم کیا جائے تو کسی نئے مسئلے کی نشاندہی ہو جاتی ہے اور یوں نا ختم ہونے والا یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ ان مسائل کے حل کی سماجی کوشش ہر وقت جاری رہنی چاہیئے۔ ان سے نمٹنے کیلئے کسی بھی ایسے طریقہ کار کا استعمال نہیں کیا جا سکتا جو ایک وقت پر شروع ہو خاص وقت پر ختم ہو جائے۔ بلکہ ان کیلئے کثیر الجہتی کوششوں پر انحصار کیا جانا چاہیئے۔

یہ کوششیں دیرپا ہونے کے ساتھ ساتھ جامع بھی ہونی چاہئیں کیونکہ ان مسائل کی جڑیں معاشرے کے ہر حصے میں موجود ہوتی ہیں اور کے پیچھے موجود وجوہات انتہائی پیچیدہ اور مختلف نوعیت کی ہوتی ہیں۔ ان کے حل کیلئے معاشروں کو اجتماعی طور پر کوشش کرنے پڑتی ہے۔ کسی ایک حصے یا مخصوص علاقے میں کی جانے والی کوشش کسی صورت کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو پاتی۔

حقیقت تو یہ ہے کہ معاشرے میں موجود ہر مسئلہ ہی کسی حد تک شرارتی نوعیت کا ہوتا ہے کیونکہ ہر مسئلہ ہی کسی نہ کسی طرح اخلاقیات اور معاشرتی اقدار سے بھی جڑا ہوتا ہے۔ ان کے بارے میں لوگوں کی مختلف رائے نتیجے میں ان کیلئے پیش کئے جانے والے حل بھی مختلف ہی ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر کسی مسئلے سے متعلق لوگوں میں ایسے رائے جنم لے سکتی ہے کہ 'پہلے ہمیں اپنے بچوں کا خیال کرنا چاہیئے' جبکہ باقی لوگ کہہ سکتے ہیں کہ 'ہمیں سب سے پہلے اپنے بڑوں کا خیال کرنا چاہیئے کیونکہ انہوں نے کسی وقت میں ہماری خاطر سخت محنت کی تھی'

یہاں تک کہ کسی ایک مخصوص حل پر عمل درآمد کرتے ہوئے بھی کچھ مشکلات پیش آ سکتی ہیں۔ مثلاً اس بات کا فیصلہ کرنا کہ کونسی چیز ہماری لئے سب سے زیادہ ضروری اور اہم ہے۔ کیا ہمیں براہ راست بچوں کی مدد

کرنے چاہیئے یا اس ضمن میں پروگرام کا آغاز کرنا چاہیئے؟ اور پھر ہر طریقہ کار کے اپنے فوائد اور نقصانات بھی ہوتے ہیں۔ کچھ حاصل کرنے کیلئے ہمیں کچھ سمجھوتے بھی کرنا پڑتے ہیں۔ اس پر ہم آگے چل کر مزید بات کریں گے تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارے کچھ فیصلے ہمیں انتہائی ناپسندیدہ کام کرنے پر بھی مجبور کر دیتے ہیں۔ اور اکثر اوقات جو کام شہری کرنے جا رہے ہوتے ہیں، ان کیلئے انہیں مشکل فیصلے ہی کرنا پڑتے ہیں۔

مختلف طریقہ کاروں کی باہمی چپقلش سے بچنا

جمہوری نظام کے اکثر مسائل اسی طرح شرارتی نوعیت کے ہی ہیں۔ یہ مسائل جمہوریت کے دیگر بنیادی مسائل سے نمٹے بغیر حل نہیں کئے جا سکتے۔ کیونکہ اکثر لوگ ان مسائل کے حل کیلئے بات کرنے کی بجائے عملی طور پر کچھ کرنا چاہتے ہوتے ہیں تو یہی وہ مقام ہے جہاں از خود حکمرانی کے حق کے استعمال کے نتیجے میں کئی مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور نتیجتاً جمہوری نظام ہی کام کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ مثال کے طور پر کچھ مسائل کو باقاعدہ طور پر تسلیم کئے بغیر ہی انہیں اخلاقی بنیادوں پر حل کرنے کی کوشش میں خود معاشرے کے اندر ہی کئی تصادم پیدا ہو سکتے ہیں۔ یہ لڑائی بنیادی طور مختلف حل تجویز کرنے والے لوگوں میں ہی پیدا ہوتی ہے۔ ان میں ہر کوئی یہی دعویٰ کرتا ہے کہ اس کا پیش کردہ حل ہی سب سے موثر اور بہترین ہے۔ لوگ پہلے سے آزمائے ہوئے کئی طریقوں میں بھی اپنی انرجی ضائع کرتے رہتے ہیں۔ لوگ ان مسائل کی نوعیت اور پہلے سے آزمائے جانے والے طریقوں پر لمبی لمبی بحثیں کرتے رہتے ہیں۔

صحت سے متعلق مسائل بھی اسی فہرست میں آتے ہیں کیونکہ ان مسائل کے حل کیلئے پیش کی جانے والے ہر تجویز اہم ہوتی ہے۔ ادارے بھی صحت کے معاملے میں لوگوں کا احساس کر سکتے ہیں مگر اس طرح ہرگز نہیں جس طرح دوسرے شہری کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ دوست، رشتہ دار اور دیگر سماجی معاملات کسی بیماری کے پیچھے موجود معاشرتی وجوہات کی بھی نشاندہی کر سکتے ہیں۔ 'سینٹرز فارڈ زیز اینڈ پریوینشن' کیلئے کی جانے والی ایک تحقیق میں بھی یہ بات سامنے آئی کہ دل کی بیماریوں، سٹروک اور پھیپھڑوں کے کینسر کے حل میں معاشرے کے لوگ اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ یہ حل یقیناً معاشرے میں موجود ان چیزوں سے نمٹ کر نکالا جاتا ہے جو دراصل ان بیماریوں کی وجہ بن رہی ہوتی ہیں۔

مکمل ترقی ہی اصل ترقی ہے

شہریوں کو دیوار سے اس لئے بھی نہیں لگایا جا سکتا کہ وہ معاشرے میں موجودہ مسائل حل کرتے ہیں بلکہ عوامی کوششیں تو سکولوں، حکومتوں اور دیگر اداروں کے کاموں کی تکمیل میں بھی مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ شہری جمہوریت سے متعلق الینر اوسٹرم کی انتہائی عملی دلیل میں بھی کچھ ایسا ہی کہا گیا تھا:

’اگر کوئی سمجھتا ہے کہ سکول لوگوں میں تعلیم اور شعور پھیلاتے ہیں، پولیس لوگوں کا تحفظ کرتی ہے اور نرسیں لوگوں کو صحتمند رکھتی ہیں جبکہ سماجی کارکن صحتمند معاشرے کا قیام عمل میں لاتی ہیں تو ان کی توجہ کا مرکز محض یہ نکتہ ہے کہ کس طرح قومی خدمت کو بہترین انداز میں سرانجام دیا جائے۔ کیونکہ ماہر ڈاکٹر، اساتذہ، پولیس افسر اور سماجی کارکن عوامی خدمت کے نظام کی مظبوطی کی ہی ضروری ہوتے ہیں۔ اس سارے عمل میں بچوں، خاندانوں، معاون گروپوں اور غیر منظم سماجی گروہوں کے کردار کو نظر انداز کرنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ معاملے کو صرف ایک زاویے سے بیان کیا جا رہا ہے۔ شاید پالیسیاں بنانے والے لوگ بھی معاملات کو اسی نظر سے دیکھتے ہیں۔ لوگ جنہیں عموماً گاہک سمجھا جاتا ہے، اس ساری صورتحال میں اہم ترین کردار ادا کرتے ہیں۔ عوام اپنی خود کی تعلیم، صحت اور معاشرتی اقدامات میں ان ماہرین کی بھرپور معاونت کرتے ہیں۔ گاہک عموماً ایسا کوئی کردار ادا کرنے کے قابل نہیں ہوتے۔ عوام کا نظام میں بطور معاون کام کرنا انہیں گاہک سے بڑھ کر درجہ دیئے جانے کا متقاضی ہے۔‘

شہریوں کی طرف سے کئے جانے والے کام دراصل سرکاری اداروں کی معاونت ہی ہوتے ہیں۔ کیونکہ عام لوگوں کا کام کرنے کا انداز باقاعدہ اداروں کے مقابلے میں مختلف ہوتا ہے۔ میں یہاں سرکاری اداروں کی معاونت کیلئے بطور رضا کار کام کرنے سے متعلق بات نہیں کر رہا جس میں لوگ اساتذہ، ماہرین اور ڈاکٹروں کا ہاتھ بٹاتے ہیں، حالانکہ وہ کام بھی قابل تعریف ہوتا ہے۔ میرے ذہن میں اس وقت وہ ضمنی کام ہیں جو عام لوگ ہی کر سکتے ہیں۔ شاید وہ کام کرنا ماہرین یا سرکاری افسران کے بس کی بات ہی نہیں ہے۔ اسی لئے میں نے یہاں شہریوں کیلئے معاون کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ورنہ شاید انہیں سرکاری ملازمین کا ساتھی قرار دیا جاتا کیونکہ وہ دونوں مل کر ایک ہی کام ایک ہی طریقے سے سرانجام دے رہے ہوتے۔ اس کی مثال یہ ہو سکتی ہے کہ لوگ پرخطر راستوں پر اپنے بچوں کی حفاظت یقینی بنانے کیلئے ان کی ساتھ چلے جاتے ہیں۔ یہ وہ کام نہیں ہے جو ماہرین یا سرکاری ملازمین کر سکیں یا جو کام کرنے کیلئے انہیں تربیت دی جاتی ہے۔

اس کی ایک اور مثال یہ ہو سکتی ہے۔ سکول بچوں کو پڑھانے کا کام تو کرتے ہیں مگر شاید ان کو تعلیم یافتہ بنانے کی ذمہ داری ان کے سر نہیں ہو سکتی۔ مگر سکول میں کام کرنے والے ان اقدامات سے سیکھ سکتے ہیں جو عام طور پر لوگوں کی طرف سے نئی نسل کو تیار کرنے کی غرض سے اٹھائے جا رہے ہوتے ہیں۔ دوسری جانب باقاعدہ تعلیم دینے کی ذمہ داری سکول ہی ادا کر رہے ہوتے ہیں۔ جبکہ ان کی معاونت عام لوگ اپنا حصہ ڈال کر کر رہے ہوتے ہیں۔ بچے جو تعلیم کلاس روم سے باہر حاصل کرتے ہیں، اس کا استعمال باقاعدہ تعلیم میں بھی لا سکتے ہیں۔ یہی سماجی

طاقتیں ایک موثر تعلیمی اداروں کے قیام میں مددگار ثابت ہوسکتی ہیں۔ کینٹکی میں سکولوں میں دی جانے والی تعلیم کے علاوہ ایک فارم پر بھی تعلیم دیئے جانے کا کام کیا جاتا ہے، جو یقیناً باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے والوں کیلئے مددگار ہے۔ الباما میں پیسرز نامی تنظیم کے زیر انتظام میں بھی سکول جانے والے لوگوں کو ایسی تعلیم دی جاتی ہے جو باقاعدہ تعلیم کا حصہ نہیں ہے۔ اس تنظیم کی طرف سے عام شہریوں کے بنانے گئے سولر ہاؤس، مچھلی فارم اور گرین ہاؤس کو بطور تجربہ گاہ استعمال کیا جاتا ہے۔ ان کوششوں کی وجہ طالبعلموں کی کلاس روم میں کارکردگی پر بھی مثبت اثر پڑا ہے۔ کئی دیگر ریاستوں میں بھی اسی طرح کے کئی منصوبے کام کر رہے ہیں۔ جو لوگ ایسے منصوبے چلا رہے ہیں وہ ابتداء میں لوگوں کو ایک پراجیکٹ پر جمع کرتے ہیں اور بعدازاں اس میں نوجوانوں کو شامل کرتے ہیں تاکہ ان کے تعلیم حاصل کرنے کے ذرائع میں اضافہ کیا جا سکے۔ یہاں معاشرہ ایک مختلف انداز سے کام کرتا دکھائی دیتا ہے۔ جس کا مقصد تعلیم پھیلانے میں مقامی وسائل کا استعمال کرنا ہے۔

کنٹکی میں لیگزنگٹن کے مقام پر بروس منڈی جو کہ مقامی وسائل سے بخوبی واقفیت رکھتے تھے، نے چند نوجوانوں کی مدد سے ایک منصوبے کا آغاز کیا جو سکول جانے والے بچوں سے متعلق ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ 'میں ایسے بچوں کو جانتا تھا جو پڑھ نہیں سکتے تھے۔ یہ بات میرے لئے پریشانی کا باعث تھی'۔ بروس ان بچوں کو ایک ایسے مقام پر لے کر گئے جو بعد میں ان کیلئے بڑا اہم اور مفید ثابت ہوا۔ وہ انہیں ایک مقامی قبرستان میں لے کر گئے جہاں خانہ جنگی کے زمانے کے ہیروز کی قبریں تھیں۔ ان بچوں نے بعد میں ان قبروں پر موجود قطبوں پر لکھے ہوئے ناموں پر تحقیق کی اور ان واقعات سے متعلق تاریخی معلومات حاصل کیں۔ یوں انہوں نے ان بچوں کو تاریخ سے متعلق علم دیا جو ایک کلاس روم میں نہیں جا رہا تھا۔ بروس کا ماننا ہے کہ بچے اپنے آباء واجداد اور تاریخی واقعات میں ہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ وہ جاننا چاہتے ہیں کہ وہ کون تھے اور مستقبل میں وہ کیا بننے جا رہے ہیں۔ اس کے بعد اگلے مرحلے میں ان بچوں نے وہی تاریخی واقعات کوڑے کے ڈبوں پر تحریر کیں۔ ان کے پاس جو بھی وسائل تھے انہوں نے استعمال کئے۔ یہ ایک حیران کن حقیقت تھی کہ بروس نے یہ کام محکمہ صحت کا ملازم ہوتے ہوئے سرانجام دیا۔ انہوں نے اور ان کے دوستوں نے وہ کام مکمل کر دکھایا جو سکول والے بھی کر رہے تھے۔

'لوگ تعلیم کے بارے میں جتنی زیادہ بات کرتے ہیں، وہ سکولوں کے علاوہ معاشرتی اداروں اور کمیونٹی کی جانب اتنے ہی زیادہ راغب ہوتے ہیں۔ میرے خیال میں بیٹن روگھ کے اس شہری سے بڑھ کر کوئی عقلمند نہیں جس کا یہ کہنا ہے کہ معاشرے میں موجود ہر بچے کو پڑھانے کیلئے ہمیں ایک معاشرتی کوشش کی ضرورت ہے نہ کہ سکولوں کے بہتر طریقہ کار کی'

خطرہ کیا ہے؟

ان تمام واقعات میں جو جمہوری نظام کام کرتا دکھائی دیتا ہے اس میں شہریوں کا کردار سب سے اہم ہے۔ یہ جمہوری نظام سمجھنا انتہائی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ یہ نظام پوری دنیا کیلئے قابل عمل اوران کی ضرورت ہے۔ یہ ان کی باقاعدہ حکومتوں میں کچھ الگ قسم کا اضافہ ہے۔ موجودہ وقت میں شہریوں کا کردار واقعی انتہائی اہم ہے۔ ہم نے اس کا عملی مظاہرہ ٹی پارٹی اور' آکوپائی وال سٹریٹ' جیسی تحریکوں میں دیکھا ہے۔ حال ہی میں وقوع پذیر ہونے والے عرب سپرنگ میں بھی عوامی طاقت کا دل کھول کر مظاہرہ کیا گیا۔ 1980 اور 1990 کی دہائیوں میں یورپ اور دیگر مغربی ممالک میں بھی کچھ ایسے انقلاب آچکے ہیں۔ آج بھی شہریوں کے کردار کو اجاگر کرنا انتہائی اہم ہو چکا ہے۔

یہ مقابلہ مختلف نظریات کے درمیان نہیں ہے جیسا کہ کمیونزم اور کیپٹلزم یا براست جمہوریت اور نمائندہ جمہوریت کے مابین پایا جاتا ہے۔ یہ مقابلہ تو عوام کے اپنے درمیان ہے، جہاں جمہوری نظام کے امور کا فیصلہ عوام کی مرضی کے مطابق آئے گا نہ کہ حکمرانوں کی خواہشات کے مطابق۔ اس صورتحال میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ شہری اپنے لئے کونسا کردار منتخب کرتے ہیں۔ یہ معاملہ خالی بحثوں تک محدود نہیں رہ سکتا بلکہ یہ ہر معاملے سے متعلق ہوگا۔ ہر معاملے میں شہری یہ فیصلہ کریں گے کہ کونسا کام ہے جو وہ نہیں کرنا چاہتے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جمہوری نظام کو کوئی خطرہ ہے۔ یہ نظام یونہی چلتا رہے گا۔ لیکن اس طرح کے منصوبے جمہوریت میں عوام کی شمولیت کیلئے انتہائی ضروری ہیں۔ اسی کے نتیجے میں ایسا جمہوری نظام قائم ہوگا جس میں شہری بھی اپنا سماجی کردار ادا کرتے ہوں گے۔

جمہوریت کے مطلب سے متعلق ہمیشہ ہی مختلف نظریات رہے ہیں۔ ان میں کونسا درست ہے؟ مگر اس نظریے میں عوام طاقتور ترین حیثیت رکھتے ہیں۔ ان سے بڑھ کر کوئی طاقت نہیں لہذا اب ہم ہی یہ فیصلہ بھی کریں گے کہ جمہوریت کا کیا مطلب ہے۔ یہ ہم لوگوں کو ہی فیصلہ کرنا ہے، ایک معاشرے سے دوسرے معاشرے تک، ایک ملک سے اگلے ملک تک اور ایک سال سے اگلے سال تک۔ ہمیں مستقبل میں کس طرح کی جمہوریت ملے گی؟ اس سوال کا جواب اس سوال سے جڑا ہوا ہے کہ ہم کس حد تک کردار ادا کرنے پر تیار ہیں۔

☆☆☆☆

باب ششم

جو علم رکھتے ہوں اور کاموں میں حصہ دار بنیں

میرا عقیدہ ہے کہ امریکہ کو شہریوں کی طرف سے کئے جانے والے ایسے اقدامات کی ضرورت ہے جو معاشرے میں موجود دیر پا اور مستقل مصیبتوں کے حل کیلئے کی جانے والی کوششوں میں سرکاری اداروں کی مدد کریں۔ مگر اس مقصد کے حصول کی راہ میں کچھ ایسی رکاوٹیں ہیں جو دراصل جمہوریت ہی کے سبب پیدا ہوئیں ہیں۔

جمہوریت کے ایسے دو بڑے مسائل ہیں۔ ایک تو لوگ اس نظام میں بھرپور طریقے سے شامل نہیں ہوتے۔ دوسرا یہ کہ اگر شہری نظام میں حصہ دار بن بھی جائیں تو ان کے پاس مطلوبہ معلومات دستیاب نہیں ہوتیں۔ عقلمندانہ فیصلے کرنے کیلئے کسی بھی شخص کا اہل علم ہونا بہت ضروری ہوتا ہے۔ پھر ایسی کونسی چیز ہوتی ہے جو لوگوں کو نظام کا حصہ بننے کی طرف راغب کرتی ہے؟ اور ایسے کونسے معاملات ہیں جن کی وجہ سے لوگ درست فیصلے کرنے لگتے ہیں؟

نظام کا حصہ کیوں بنا جائے؟

ہم میں سے بہت سے لوگ جمہوری نظام میں اس وقت شامل ہو جاتے ہیں جب ہم اپنا کوئی مسئلہ حل کرنے کیلئے کوشاں ہوتے ہیں یا پھر جب ہم کسی منتخب شدہ ادارے یا سرکاری افسران پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ کوئی ایسا مسئلہ جس سے متعلق ہم انتہائی سنجیدہ رویہ رکھتے ہوں وہ بھی ہمیں دوسروں کے ساتھ تعاون کرنے پر مجبور کر سکتا ہے اور نتیجتاً ہم کسی معاشرتی تحریک کا حصہ بن جاتے ہیں۔ مثلاً کوئی بھی شخص اپنے معاشرے میں موجود سکولوں کو بند کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ اگر ایسا کوئی اقدام ہونے کو ہو جس کا براہ راست اثر ہم پر پڑ رہا ہو تو ہم اس کے خلاف ردعمل دیتے ہیں۔ اکثر لوگ بیشتر سیاسی فیصلوں سے براہ راست متاثر نہیں ہوتے۔ اس کے باوجود ہمیں ان فیصلوں سے جڑے معاملات میں دلچسپی ہوتی ہے۔ کیونہ ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارا مستقبل ان فیصلوں کی روشنی میں ہی ترتیب پائے گا۔ یہ فیصلے آنے والے وقت میں ہمارے لئے مشکلات کھڑی کر سکتے ہیں۔

ہمارے آباء واجداد کے دیئے گئے اسباق اور نصیحتیں بھی ہمارے سیاسی مقاصد اور دلچسپی کے ضمن میں اہم ترین کردار ادا کرتے ہیں۔ ایسے معاملات ہی ہمیں ہمارے خاندان اور حلقہ احباب سے جوڑے رکھتے ہیں۔ آج ایسی بہت سی سائنسی تحقیقات بھی ہو چکی ہیں جو انتہائی پرانے حالات سے متعلق معلومات مہیا کرتی ہیں۔ اسی بنیاد

پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ سب سے پہلے وقت کے لوگ جو شکار کر کے گزارہ کرتے تھے، اپنی آزادی پر کوئی سمجھوتہ کرنے کو تیار نہ تھے۔ وہ دوسروں کے ساتھ معاہدے اپنی حفاظت کو مدنظر رکھ کر کرتے تھے۔ یہی چیز انہیں شکار کرنے میں بھی مدد دیتی تھی۔ مزید یہ کہ جس طرح وہ مل کر گروہوں میں رہتے تھے، ایسے رہنا باہمی اتفاق اور مشترکہ کوششوں کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ اس کی سادہ مثال یہ ہے کہ جو لوگ شکار کرتے تھی انہیں بعد میں کھانا کھانے کیلئے جگہ کی ضرورت ہوتی تھی۔ جس کیلئے دوسرے لوگ ان سے تعاون کرتے تھے۔ اس بات کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ آزادی، برابری اور اجتماعی حفاظت ہمیشہ سے ہی انسان کیلئے اہم رہی ہے۔

اس وقت کے انسانوں کو کئی خونی جھگڑوں کا بھی سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اس کے باوجود ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہمارے آباء ایسی چیزوں کی بہت قدر کرتے تھے جو ان کی حفاظت اور ترقی میں مددگار ثابت ہوتی تھیں۔ ایسے خیالات درست ہوں یا نہ ہوں یہ آج ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ عوام کوئی بھی بڑا فیصلہ کرتے ہوئے ان چیزوں کو مدنظر رکھتے ہیں جو ان کیلئے انتہائی ضروری ہوتی ہیں۔ ایسی چیزیں جن کے بغیر ان کی زندگی نامکمل ہو۔

انہی چیزوں کو انسانی زندگی کی قدریں بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ کچھ لوگ اس سے میری مراد وہ باتیں سمجھ رہے ہوں گے جو انجیل میں بیان کی گئی ہیں، جیسا کہ میرے دوست ہوڈنگ کارٹر جونیئر نے بھی بتایا۔ میری مراد وہ چیزیں ہیں جن کو انسان اپنی زندگی میں میں عزیز ترین تصور کرتا ہے۔ موجودہ دور کے عمرانی اور نفسیاتی ماہرین انہی چیزوں کو انسانی زندگی کے مقاصد بھی قرار دے سکتے ہیں۔ یہی وہ چیزیں ہیں جن پر کسی کی زندگی ختم ہوتی ہے۔

لوگوں کیلئے اجتماعی طور پر یا سیاسی لحاظ سے کیا اہم ہوگا؟ یہ کسی کی ذاتی اقدار اور مفادات سے مختلف ہو سکتا ہے۔ نفسیاتی ماہر ابراہم ماسلو کے مطابق معاشرے کے سیاسی نظریات بھی اسی طرح ایک سے ہوتے ہیں جیسے انسانوں کی بنیادی ضروریات مثلاً کھانا، پینا اور رہنے کی جگہ۔ تمام سیاسی معاملات کسی نہ کسی طرح انہی ضرورتوں سے جڑے ہوتے ہیں۔

میں اس بات پر زور دینا چاہتا ہوں کہ ہماری بنیادی ضرورت کی چیزیں سب لوگوں کیلئے یکساں طور پر اہم ہوتی ہیں۔ ہم میں سے اکثر لوگ خطرے سے محفوظ ہونا چاہتے ہیں۔ ہم اپنی خوشحالی کی خاطر آزاد ہونا چاہتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ساتھ انصاف روا رکھا جائے۔ یہ وہ مقاصد ہیں جو ہمیں سیاسی معاملات میں شامل کر دیتے ہیں۔ اور درحقیقت یہی وہ چیزیں ہمیں جو ہماری لئے اہم ترین اور ہماری روح کے قریب ہوتی ہیں۔

اکثر لوگوں کو زندگی میں مادی اشیاء جیسا کہ خوراک ہی درکار ہوتی ہیں۔ کچھ لوگوں کو جو غیر مادی اشیاء چاہئے ہوتی ہیں ان میں پیار سرفہرست ہے۔ مگر ایسی چیزیں قدرے کم ضروری تصور کی جاتی ہیں۔ یہی معاملہ مشترکہ امور کے ساتھ بھی ہے۔ یہ چیز میں نے ایک ایسے معاشرے سے سیکھی ہے جہاں اعلیٰ عہدوں پر فائز لوگ

مالی بے ضابطگیوں میں ملوث تھے۔ایسا معاشرہ جس کی گلیوں میں جرائم کا ارتکاب ہورہا ہوتا تھا۔وہاں کے شہریوں کو پوچھا گیا ان کیلئے اہم ترین چیزیں کیا ہیں؟ان میں سے تقریباً ہر ایک کا کہنا تھا کہ وہ ایسی جگہ پر رہنا چاہتے جس پر انہیں فخر ہو۔یہی فخر پرانے وقتوں سے لوگوں کی پہچان رہا ہے۔مگر یہ غیر مادی توقع عام طور پر کاغذات اور سرکاری منصوبوں میں نظر نہیں آتی۔مگر اس کے باوجود یہ عنصر اہم سیاسی معاملات کا حصہ ہوسکتا ہے۔

ڈینڈل بیری نے ان چیزوں سے متعلق بات کرتے ہوئے جنہیں لوگ عموماً اہم تصور کرتے ہیں،ایک زرعی معیشت کے ماہر کا بیان قلمبند کیا ہے جو کسانوں کو زمین کرائے پر لینے اور اس کی ملکیت رکھنے میں فرق بتا رہا تھا۔اس کو ایک کسان نے یوں جواب دیا کہ اس کے آباؤ اجداد امریکہ میں اس لئے نہیں آئے تھے کہ یہاں آکر کرائے دار بن جائیں۔کسان کی بات سے ظاہر ہورہا تھا کہ اس کو منافع کے ساتھ ساتھ زمین کی ملکیت سے متعلق بھی تحفظات تھے۔اسی کسان نے مزید یہ بھی بتایا کہ اس کے دادا جو اسی زمین میں کاشت کاری کیا کرتے تھے، کہتے تھے کہ ان کی مزید میں اب اضافہ نہیں ہو پا رہا۔

نام میں آخر کیا ہے؟

ایسے امریکی شہری جو سیاسی معاملات سے لاتعلق نظر آتے ہیں انہیں شاید روزمرہ زندگی کے مسائل اور حکومتی پالیسوں کے مابین موجود تعلق کا ادراک نہیں ہوتا۔یہی وہ معاملات ہوتے ہیں جن پر غیر سرکاری تنظیمیں، میڈیا اور سیاستدان ہر وقت بحث و مباحثہ کرتے رہتے ہیں۔ان مسائل کو ماہرین نے کچھ ایسے تکنیکی نام دے رکھے ہوتے ہیں جو عام لوگوں کو اپنے مسائل سے متعلقہ نظر نہیں آتے۔لوگوں کو سیاسی عمل میں شریک کرنے کیلئے انہیں ایسی چیزیں جنہیں وہ عزیز رکھتے ہیں، سے متعلق مزید آگاہی دینے کی بجائے سیاست اور ان روزمرہ معاملات کے مابین پایا جانے والا تعلق سمجھایا جانا چاہئے۔

تقریباً روزانہ ہی کچھ عجیب اور پریشان کن واقعات وقوع پذیر ہوتے ہیں۔امتحانات میں نوجوانوں کے مختلف گروہ مختلف نتائج دکھاتے ہیں۔امریکہ دوسرے ممالک کی نسبت صحت پر زیادہ پیسے خرچ کرتا ہے مگر اس کے باوجود نتائج تسلی بخش نہیں ہیں۔جب کسی کا ایسے مسائل سے سامنا ہوتا ہے تو پھر وہ بھی ان معاملات سے متعلق جاری گفتگو کا حصہ بن جاتے ہیں۔آخر مسئلہ کیا ہے؟انہی مسائل سے متعلق جلد ہی اخبارات، بلاگز اور ٹی وی شوز میں بحث ہونے لگتی ہے۔جہاں لوگ مسائل کو بیان کرتے ہیں اور ان کیلئے مناسب حل تجویز کرتے ہیں۔وہ یہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ آخر کیوں متوقع نتائج سامنے نہیں آتے؟

مسائل کو دیئے جانے والے نام شاید غیر ضروری ہوں مگر سیاسی لحاظ سے یہ ضرور اہم ہوتے ہیں۔کوئی مسئلہ کس سے متعلق ہے؟اور اس مسئلے کے حل کیلئے کون میدان عمل میں اترے گا؟ان سوالوں کے جواب مسائل کو دیئے جانے والے ناموں میں ہی موجود ہوتے ہیں۔یوں جمہوریت میں لوگوں کی عدم شمولیت کے مسئلے کا بھی

تدارک کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اکثر مسائل لوگوں سے متعلق ہی ہوتے ہیں اوران کے حل کیلئے عوام کو ہی کچھ کرنا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر' کامیابی کے تناسب میں کمی' کی اصطلاح سیاستدانوں اور تعلیمی ماہرین کی طرف سے تو استعمال کی جاتی ہے مگر عوام کو اس سے متعلق کم ہی معلوم ہے۔ عام لوگ تعلیمی کامیابی کے کم ہوتے تناسب کی وجہ کمزور ہوتی معیشت کو قرار دیتے ہیں اوران میں باہمی تعلق قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

سمجھدارانہ فیصلے یا جلد بازی؟

کسی معاملے میں شامل ہو جانا آدھی کامیابی ہے۔ لوگ شاید آپس میں مل کر کام کریں مگر مناسب نتائج پیدا نہ کرسکیں جس سے سارے سماج کو فائدہ ہوسکتا ہو۔ ناقدین کہتے ہیں کہ اس صورت میں منصوبوں کا حصہ بننے والے لوگوں کے پاس مطلوبہ معلومات موجود نہیں ہوتیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر ماہرین اور سرکاری یہ سمجھتے ہیں عام لوگ عقلمندانہ فیصلے کرنے میں ناکام رہیں گے۔

ایک عورت جس کا گھر کرائے پر دی ہوئی عمارتوں میں گھرا ہوتھا، اس نے ایک دن اپنی گلی میں ہاتھا پائی کا منظر دیکھا۔ اس واقع کی بنیاد پر اس نے سوچا کہ شاید اس کی وجہ کرائے پر عمارتیں دیتے وقت طے کی جانے والی نرم شرائط ہیں۔ اس نے جرائم سے متعلق مزید ریسرچ کئے بغیر ای میلز کے ذریعے ایک مقامی تحریک شروع کر دی۔ اس نے اپنے کچھ مزید ساتھیوں کے ہمراہ سماجی رابطوں کی ویب سائیٹس پر کرائے داری قانون میں کچھ سخت شرائط کے اضافے کیلئے حکومت پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ اس قانون سازی کے نتیجے میں قانون کا احترام کرنے والے کرائے دار بھی مشکلات کا شکار ہو گئے۔ یہاں یہ کہا جا سکتا ہے جذباتی کیفیت کی موجودگی میں اس عورت سے عقلمندانہ فیصلہ سازی نہیں ہوسکی۔

اس واقعے میں حقائق سے متعلق آگاہی پر زور دیا گیا ہے مگر صرف حقائق جاننا ہی کافی نہیں ہے۔ اخلاقیات اور معاشرے سے جڑے معاملات میں دانشمندانہ فیصلوں پر عملدرآمد محض حقائق جاننے سے زیادہ ضروری امر ہے۔ یہ وہ صورتحال ہوتی ہے جس میں یہ جاننا ہوتا ہے کہ آخر درست کیا ہے؟ اس صورتحال میں یہ ایک مناسب فیصلہ ہوسکتا ہے کہ ان میں درست معلومات کی بنیاد پر آگاہی پھیلائی جائے۔ بظاہر اس حل میں کوئی غلط چیز دکھائی نہیں دیتی۔ اس کے باوجود ایسے معاملات میں درکار درست معلومات کے بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا کیونکہ سوال ہوتا ہے کہ آخر درست کیا ہے؟ مثال کے طور پر کیا سکولوں میں ریاضی اور سائنس سے متعلق مضامین زیادہ پڑھائے جانے چاہئیں، یہاں تک کہ اس مقصد کیلئے عمرانیات یا دیگر مضامین ختم ہی کیوں نہ کرنے پڑیں؟ کیا ہمیں انٹرنیٹ پر آزادانہ رائے کے اظہار پر پابندی لگا دینی چاہئے، چاہے اس سے بنیادی حقوق پر حرف آتا ہو؟ ان سوالوں کے جوابات یک طرفہ معلومات کی بنیاد پر نہیں دیئے جا سکتے۔ ان کیلئے فیصلہ سازی کی صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ کچھ چیزیں لوگوں کیلئے عزیز ترین ہوتی ہیں اور ایسے فیصلے کرتے ہوئے ایسی چیزیں ذہن میں

رکھنا ہوتی ہیں۔اس لئے اس قسم کے فیصلے کرتے ہوئے محض حقائق سے متعلق معلومات ہونا کافی نہیں ہوتا۔

حقائق سے متعلقہ اور دانشمندانہ فیصلہ سازی سے متعلق معاملات کا فرق یوں بھی واضح کیا جا سکتا ہے۔ کسی دریا کے پار جانے کیلئے کوئی پل کتنا لمبا ہونا چاہئے؟ اور اس پر سے ٹریفک کے گزرنے کیلئے اس کا کتنا مضبوط ہونا چاہئے؟ کسی ساحلی علاقے میں ایسا پل تعمیر کرنا حقائق سے متعلق معاملہ ہے جبکہ ایسا ہی پل کسی جزیرے میں تعمیر کرنا فیصلہ سازی کے ہنر سے متعلق ہے۔ حقائق کا جاننا بھی ضروری ہے مگر ان علاقوں کے لوگوں کیلئے اہمیت کی حامل چیزوں کو مدنظر رکھنا بھی ایک ضروری مرحلہ ہے۔ یہی معاملہ کسی کی فیصلہ سازی کی اہلیت کو بھی ظاہر کرتا ہے۔

ایسے معاملات میں فیصلہ کرنا مزید بھی مشکل ہوتا ہے کیونکہ ان میں جن چیزوں پر اثر پڑ رہا ہوتا ہے وہ لوگوں کو بے حد عزیز ہوتی ہیں۔ ہمیں دستیاب آپشنز پر غور کرنا ہوتا ہے اور اس دوران ہم رسہ کشی کی سی صورتحال سے گزرتے ہیں۔ ہمیں روزمرہ کے معاملات میں ذاتی فیصلے کرتے ہوئے بھی ایسے صورتحال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

آپ کسی ایسے شخص کو تصور کریں جو دفتر میں سخت محنت کے بعد گھر لوٹا ہے اور آرام کرنا چاہتا ہے۔ مگر اس کی اہلیہ جو دن بھر گھر کی دیکھ بھال کرتی ہیں، چاہتی ہیں وہ ان کے ساتھ کسی ہوٹل میں رات کا کھانا کھانے چلے۔ دوسری جانب بچے فلم دیکھنے جانا چاہتے ہیں۔ اس صورتحال میں اس سے پہلے کہ وہ یہی مسئلے حل کرتا، اس کے سسرال سے فون آتا ہے جو اس سے نظرانداز کئے جانے کا شکوہ کرتے ہیں اور درخواست کرتے ہیں کہ وہ آج کی شام ان کے ساتھ گزاریں۔ اس شخص کیلئے بیوی، بچے اور سسرال سب ہی اہم ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کو بھی دوسرے پر ترجیح دینا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ اور پھر فلم جلد ہی شروع ہونے والی ہے لہذا اس کو جلد ہی فیصلہ بھی کرنا ہے۔ اس صورتحال میں تمام فریقوں سے بات چیت اور مذاکرات کا وقت نہیں ہے۔

ساری صورتحال کا جائزہ لینے کے بعد وہ جوڑا فیصلہ کرتا ہے کہ وہ دونوں عشائیے کیلئے جائیں گے اور راستے میں بچوں کو سینما چھوڑتے جائیں گے۔ وہ سسرال جانے ارادہ فی الحال ملتوی کر دیتے ہیں۔ وہ فیصلہ کرتے ہیں کہ وہ کسی اور دن سسرال والوں کی طرف بھی جائیں گے۔ یوں انہوں کچھ لین دین اور سوچ بچار کے ذریعے صورتحال کا حل نکالا۔ ہم بھی دیگر شہریوں کے ہمراہ فیصلہ سازی کرتے ہوئے یونہی کرتے ہیں۔

ایسے لوگ جو ہمارے دوست یا رشتہ دار نہیں ہوتے ان کے ہمراہ فیصلہ سازی کرنا قدرے مشکل کام ہے۔ کیونکہ ان کیلئے کچھ اور چیزیں اہم ہوتی ہیں اور ہمارے لئے کچھ مختلف چیزیں قدر و منزلت رکھتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم لوگ مختلف حالات میں زندگیاں گزار رہے ہوتے ہیں۔ میرے لئے سکیورٹی ایک اہم معاملہ ہے

کیونکہ میں جہاں رہتا ہوں وہاں آئے دن نقب زنی ہوتی رہتی ہے۔ میں اس وجہ سے پولیس کا پہرا سخت چاہتا ہوں۔ میرا ایک دوسرا دوست جو قدرے محفوظ علاقے میں رہائش پذیر ہے۔ وہ بھی سکیورٹی کو اہم تو ضرور سمجھتا ہے مگر وہ سارے علاقے کو چھاؤنی جیسا بنانے کے خلاف ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعض معاملات کو یکساں اہمیت دیئے جانے کے باوجود ضروری نہیں کہ لوگ ان پر اتفاق بھی کر لیں۔

فیصلہ سازی کی انسانی اہلیت

جب کبھی درست یا غلط سے متعلق ابہام پیدا ہوتا ہے تو ہمیں فیصلہ سازی کی انسانی اہلیت پر انحصار کرنا پڑتا ہے جو ہمیں قدرت کی طرف سے عطا کی گئی ہے۔ مختصراً یہ کہ وہ فیصلہ درست تصور کیا جائے گا جو ہمیں عزیز چیزوں کا تحفظ یقینی بنائے۔ گیلی سڑک پر آہستہ گاڑی چلانا ایک سمجھدارانہ فیصلہ ہوسکتا ہے کیونکہ یہ ہمیں تاخیر کا شکار تو کرتا ہے مگر یہ ہمیں محفوظ بھی بناتا ہے۔ کیونکہ کچھ چیزیں ہمارے لئے اہم ہوتی ہیں تو ہمیں مخصوص حالات میں فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ ہمیں کن چیزوں کو دوسروں سے کچھ زیادہ اہمیت دینی ہے کن چیزوں کو دوسرا درجہ دینا ہے۔ ان سب معاملات میں توازن پیدا کرنا ہی اصل امتحان ہے۔

نیوروسائنس ہمیں انسانی دماغ کے فیصلہ سازی کے نظام سے متعلق معلومات فراہم کرتی ہے۔ ریسرچ سے ثابت ہوا کہ اپنے تجربات اور خیالات پر دوسروں سے تبادلہ خیال کرنے اور مختلف آراء کا جائزہ لینا درست فیصلے کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یہ صورتحال بار بار فیصلہ سازی کے مرحلے سے گزرنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ مگر اس معاملے پر ہم بات اگلے باب میں جا کر کریں گے۔

یقینی طور پر لوگ ہمیشہ ہی درست فیصلے نہیں کرتے۔ ہمیں فیصلہ سازی کی صلاحیت دی گئی ہے مگر ضروری نہیں کہ ہم ہمیشہ اس کا مناسب استعمال بھی کریں۔ عوامی فیصلہ سازی ایک مشکل کام ہے، یہ پریشانیوں سے بھرپور راستہ ہے۔ مگر ایک ایسے معاشرے میں جہاں ان معاملات پر کھلی بحث کی جاتی ہے وہاں ایسی مصیبتوں سے بچا جا سکتا ہے۔ یہ سب قدرتی ہوتا ہے اس کا مطلب ہرگز نہیں کہ یہ سب آسان ہے۔ بعض اوقات تو یہ انتہائی مشکل ہو جاتا ہے۔

لوگوں میں فیصلہ سازی کی صلاحیت ہونے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ان کے دماغ میں ایسا کوئی اضافی خانہ موجود ہوتا ہے جو سرکاری افسران کے دماغ میں نہیں ہوتا یا پھر ان میں ایسی صلاحیت ہوتی تو ان کی طرف سے غلط فیصلے نہ کئے جاتے۔ مزید یہ کہ اگرچہ لوگوں کے فیصلے ان کے حالات کو مدنظر رکھ کر کئے جاتے ہیں اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں کہ یہ فیصلے مستقبل میں بھی بہترین ثابت ہوں گے۔ ہم کسی فیصلے کے درست ہونے کا اندازہ اس وقت تک نہیں کر سکتے جب تک ہم اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے اثرات کا عملی مشاہدہ نہ کر لیں۔

’تمام معاشروں میں مسائل پر آزادانہ بحث ہونی چاہئے جس میں ہر کوئی شریک ہو سکے۔ جمہوری کا واحد مقصد یہی ہے کہ ہم ایک دوسرے سے مشورہ کر سکیں۔ یہی ایک طریقہ ہے جس کے ذریعے ایسے عوامی مفادات جن سے سب کو یکساں فائدہ ملے، کو پالیسیوں میں شامل کیا جا سکتا ہے‘--ووڈرو ولسن

☆☆☆☆

باب ہفتم

عوامی بحث اور عوامی فیصلہ سازی

قدیم زبانوں نے عقل کی خداداد صلاحیت کا استعمال کر کے فیصلے کرنے کا گر سکھایا ہے۔ پرانی مصری زبانوں اور چینی تہذیب میں اس ضمن میں لفظ بحث کثرت سے ملتا ہے۔ یہ دراصل ایک عمل ہے جس میں ساری صورتحال کا بھرپور جائزہ لیا جاتا ہے۔ تمام وسائل اور مواقع اور ان کے نتائج پر غور کیا جاتا ہے۔ اسی کی بنیاد پر عوامی مسائل کی سمت متعین کی جاتی ہے۔

فیصلہ کرنے کیلئے بحث کرنا

بحث کرنا، بلکہ عوامی بحث ایک ایسا عمل ہے جو تاریخی لحاظ سے مناسب خیال کیا جاتا ہے۔ میرا اس معاملے پر تھوڑا سا اختلاف یہ ہے کہ کسی مسئلے پر بحث کرنے کیلئے بھی لوگوں کو مطلوبہ معلومات ہونا ضروری ہوتا ہے۔ لاطینی زبان میں اسی عمل کیلئے لفظ 'لائبیرا' استعمال کیا جاتا ہے جس کا مطلب 'وزن کرنا' ہے۔ شاید یہ اصطلاح کسی چیز کی اہمیت کا تعین کرنے کیلئے استعمال کی جاتی رہی ہو۔ یوں جہاں کہیں بھی ایک سے زیادہ چیزوں کی اہمیت کا تقابلی جائزہ لینا درپیش ہو ہم دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر بحث کرتے ہیں۔

کسی چیز کی قدر و منزلت طے کرتے ہوئے ہمیں فیصلہ سازی کی عقلی صلاحیت کا بھی استعمال کرنا پڑتا ہے۔ یہ صلاحیت ہمارے فیصلوں پر براہ راست اثر انداز ہوتی ہے اور عموماً ان کو بہتر کرنے کیلئے ضروری ہوتی ہے۔ اس معاملے پر میرے خیال میں پیریکل کا فارمولا زیادہ موثر دکھائی دیتا ہے۔ جس کے مطابق کسی معاملے پر بحث میں حصہ لینے سے پہلے خود یہ سیکھنا چاہئے کہ اس صورتحال میں کیا کیا جانا چاہئے؟ اینٹی ڈوسز میں بھی عام بحث اور سائنسی تجزیے یا عقلی توجیہہ تلاش کرنے کے عمل میں موجود فرق کو واضح کیا گیا ہے۔ ارسطو نے تو اس معاملے میں اخلاقی توجیہہ کو بھی شامل کیا ہے جو عملی دانائی کو جنم دیتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے پرانے زمانے سے ہی لوگوں میں اس حوالے آگہی موجود تھی کہ سائنسی بنیادوں پر وجہ تلاش کرنے اور فیصلہ سازی سے متعلق بحث میں گہرا فرق ہوتا ہے۔

نیشنل ایشوز فورمز کے تحت ہونے والی مختلف بحثیں اس ضمن میں بطور مثال پیش کی جا سکتی ہیں۔ 1980 کی دہائی سے سکولوں اور کالجوں میں اس طرح کی کئی تقریبات منعقد کرائی جاتی ہیں۔ ان بحثوں کو گرجا گھروں، مقامی کمیونٹی کونسلز، انتظامیہ یا یہاں تک کہ کچھ جیلوں کے افسران کی طرف سے بھی منعقد کروایا جاتا ہے۔ صدارتی

لائبریریاں، خواتین سے متعلقہ کلبز اور وکلاء تنظیمیں بھی اس طرح کے فورم منعقد کروانے میں پیش پیش رہی ہیں۔

یہ فورمز نکتہ اختلاف پر اظہار اور بحث کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ اس کے باوجود ایسے مقامات پر لڑائی یا شور شرابے کے واقعات انتہائی کم وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ ایک مرتبہ ایڈز سے متعلق ایک بحث میں ایک ایسا شخص شامل ہو گیا جس کا نظریہ تھا کہ یہ بیماری خدا کی طرف سے سزا ہے۔ یہ شخص پہلی ہی صف میں موجود تھا، اس کی گفتگو کی وجہ سے پہلے کی جانے والی ساری بحث کی سمت متاثر ہو گئی مگر اس کو بولنے دیا گیا۔ اس کے بعد ہال میں موجود لوگوں سے پوچھا گیا کہ اور کون کون اسی طرح کے عقائد رکھتا ہے۔ اس پر کچھ لوگوں نے ہاتھ کھڑا کر دیا حالانکہ اس سے اتفاق کرنے والے لوگ چند ایک ہی تھی۔ اس وجہ سے اس کا نقطہ نظر تو تبدیل نہ ہو سکا مگر اس کا بات کرنے کا انداز ضرور تبدیل ہو گیا۔ اب وہ شور مچانے کی بجائے پرسکون انداز اپنا چکا تھا۔ فورم کے اختتام میں لوگوں نے اس بحث کے بارے میں رائے دی اور بتایا کہ کس طرح وہ شخص باقی لوگوں سے ہٹ کر بات کر رہا تھا اور اس کی بحث میں کیا کیا خامیاں تھیں۔ ایڈز سے متعلق اخلاقی اختلاف تو اپنی جگہ پر قائم رہا مگر یہ ایک مشترکہ معاشرتی مسئلہ تھا جو اخلاقیات سے زیادہ جذبات سے جڑا ہوا تھا۔

اگر یہ پوچھا جائے کہ کیا اس فورم کے تحت ہونے والی بحثیں ہمیشہ ہی اس قدر آزادانہ ہوتی ہیں؟ تو اس کا جواب نہیں ہے۔ بعض بحث صرف بات چیت تک ہی محدود ہو کر رہ جاتی ہے۔ لیکن جب لوگوں کو فیصلہ سازی درپیش ہوتی ہے وہ عام طور پر اجتماعی موقف کے ساتھ ہی کھڑے ہوتے ہیں کیونکہ اس طرح کی بحث کسی حد تک معاشرتی سوچ میں یگانگت پیدا کر دیتی ہے۔

کیا بحث میں صرف معلومات رکھنے والے شریک ہو سکتے ہیں؟

کیا ہر کوئی ایسے بحث و مباحثے میں شامل ہو سکتا ہے یا صرف عقل و فہم اور معلومات رکھنے والے افراد ہی اس عمل کا حصہ بننا چاہئیں؟ زندگی کے تمام ہی میدانوں سے تعلق رکھنے والے لوگ عوامی بحث میں شریک ہوتے آئے ہیں اور کسی بھی گروہ میں اس ضمن میں کوئی کمی نظر نہیں آتی۔ مثال کے طور پر پروفیسر بونی بران اور ایک ریسرچ ٹیم نے یونیورسٹی آف میری لینڈ میں ایسے مباحثوں کا انعقاد کروایا۔ انہوں نے اس مقصد کیلئے غریب اور دیہاتی پس منظر رکھنے والی خواتین کو مدعو کیا۔ ان کی تحقیق میں یہ بات سامنے آئی کہ یہ خواتین بھی بحث کے عمل میں بالکل اسی طرح حصہ لے سکتی ہیں۔

اس بات کو تسلیم کیا جانا ضروری ہے کہ عوامی بحث ایسا عمل نہیں جس میں گروہوں کو بیرونی امداد دی جا سکتی ہو۔ یہ ایک ایسا طریقہ نہیں جو سیکھا جا سکے بلکہ اس کا تعلق فیصلہ سازی کی خداداد صلاحیت کے استعمال سے ہے۔

'لفظ بحث کو آج کئی مختلف گروہوں کی طرف سے استعمال کیا جاتا ہے۔ مگر اس لفظ سے مراد سادہ

بات چیت ہرگزنہیں بلکہ اس سے مرادعوامی بحث ومباحثہ ہے۔ کیٹرنگ فاؤنڈیشن یہ سمجھتی ہے کہ ہماری طرف سے دی جانے والی ہر تعریف درست نہیں ہے اور ہمارا خیال ہے کہ عوامی بحث کے مطلب سے متعلق وضاحت کی ضرورت ہے۔

حالیہ سالوں میں سیاسی مباحثوں کو بہت ترویج ملی ہے مگر یہ پرامن ہونے کی بجائے زیادہ تر تباہ کن ہی ہوتے ہیں۔ عوامی بات چیت کی یہ پہچان رہی ہے کہ یہ مختلف نقطہ نظر رکھنے والے لوگوں کو ایک جگہ اکٹھا ہونے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ اس سے دوسروں کی آراء کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ایسے تبادلہ خیال سے لوگوں کو ایسی معلومات بھی مل سکتی ہیں جو فیصلہ سازی کے عمل میں اہم کردار ادا کرسکتی ہیں۔ یا پھر کسی پیچیدہ مسئلے کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔

اس کے مقابلے میں عوامی بحث کے عمل کا مقصد یگانگت اور بھائی چارے کا فروغ ہوتا ہے۔ اس کا تعلق براہ راست فیصلہ سازی کے عمل سے ہوتا ہے۔ اس عمل کیلئے اخلاقیات کی بنیاد پر ہونے والے اختلافات سے متعلق ضروری معلومات ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اس عمل میں مختلف آراء میں سے درست کا فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ اور اس مقصد میں بعض اوقات معلومات سے بھرپور بحث بھی ناکام ہوجاتی ہے۔

روزمرہ کی بحث

تمام مباحثیں خاص مواقعوں پر ہی نہیں ہوتیں بلکہ لوگ روزمرہ کے معاملات کے دوران بھی سیاسی مباحثے کرتے ہیں مگر اس عمل میں معمولی بات چیت بھی شامل ہوتی ہے۔ اور شاید عوامی بحث کے موضوع کو روزمرہ معاملات سے جڑی جمہوریت کے ذریعے بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ جہاں شہری اپنے مسائل سے متعلق خود اقدامات اٹھاتے ہیں۔ اجتماعی فیصلہ سازی کا عمل عوامی بحث کے بغیر مکمل نہیں ہوتا کیونکہ ان معاملات میں کئی اختلاف اور مخالف نقطہ نظر سامنے آتے ہیں۔ یوں ایک متفقہ فیصلہ کئے بغیر کسی معاملے پر پیش رفت کرنا عوام کیلئے مشکل عمل ہوسکتا ہے۔

روزمرہ کے امور میں بھی بات چیت فیصلہ سازی اور عمل کے ساتھ ساتھ ہی چل رہی ہوتی ہے۔ اور کسی حد تک عمل کرنا ہی بحث کے رخ کا تعین کررہا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر جب کوئی معاشرہ کسی مسئلے کے حل کیلئے کوشاں ہوتا ہے تو وہ اس ضمن میں کئے جانے والے اقدامات اور ان کے نتائج کی بنیاد پر بحث کرتے ہیں اور

مستقبل میں اٹھائے جانے والے اقدامات پر غور کرتے ہیں۔ وہ ان اقدامات کو اٹھانے کے دوران پیش آنے والی مشکلات کا بھی جائزہ لیتے ہیں اور ان کے حل کیلئے تجاویز لیتے ہیں، یہ سب بحث کے ذریعے ہی ممکن ہوتا ہے۔ عمل کے بغیر بات چیت کرنے کا کوئی فائدہ ہو ہی نہیں سکتا۔

لوگ عام دنوں میں ان مسائل پر باتیں کرتے ہیں جن سے متعلق وہ پریشانی میں مبتلا ہوتے ہیں۔ وہ ان کیلئے مختلف حل تجویز کرتے ہیں۔ جن پر عمل کیا جانا ہوتا ہے۔ اس کے باوجود ان کے بحث شاید اتنی بامقصد نہیں ہوتی کیونکہ وہ اکثر اوقات اس بات چیت میں کسی کو ان مسائل کا ذمہ دار ٹھہرانا شروع کر دیتے ہیں۔ اس سطح پر دستیاب وسائل کا جائزہ شاید اس طرح نہیں لیا جاتا جس طرح باقاعدہ عوامی مباحثوں میں لیا جاتا ہے۔ یہ مباحثے سیاسی عمل کا متبادل تو نہیں ہیں مگر یہ عام بات چیت سے کچھ بڑھ کر ہوتے ہیں۔ سیاسی عمل میں لوگ مختلف سطح پر کام کر رہے ہوتے ہیں اور کسی حد تک اس میں بھی عوامی بحث شامل ہوتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ لوگ بات چیت کا آغاز کسی مسئلے سے کریں اور پھر اس کے حل کے حوالے سے اپنے عہدے اور مقام کی بات کریں۔

یہ بھی ہوسکتا ہے عوامی بحث کہیں ہوتی دکھائی ہی نہ دے کیونکہ یہ ہلچل تو لوگوں کے ذہن میں ہر وقت چل رہی ہوتی ہے۔ بحث کے معاملے جس قدر بولنا اہم ہے اس سے کہیں بڑھ کر دوسروں کی بات سننا اہم ہوتا ہے۔ ہم کسی کی بات غور سے سن کر ہی سمجھ سکتے ہیں کہ آخر بولنے والا کس نقطہ نظر کی وکالت کر رہا ہے۔ اور سننے کے عمل میں یہ بھی ضروری نہیں کہ ہم اس کے نقطہ نظر سے اتفاق بھی کر رہے ہوں۔

ہمارے ادارے نے یہ فرض کیا کہ لوگوں میں عوامی بحث کا حصہ بننے کی بھرپور صلاحیت موجود ہوتی ہے، اور اس پر مزید تحقیق کرنے کی کوشش کی۔ اس کیلئے ہم نے جین مینسبرج کی طرف سے تجویز کئے گئے مباحثے کی بنیاد پر قائم معاشرے کے نظریے پر ریسرچ کی۔ یہ معاشرہ گھر کے پچھلے حصے میں، کافی کی دکانوں میں ہونے والی بحث کے نتیجے میں تشکیل پاتا ہے۔ لوگ ان سے بات چیت کا آغاز کرتے ہیں جو ان کے دوست یا جاننے والے ہوتے ہیں۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل ہو سکتے ہیں جن کی سوچ ان سے ذرا مختلف ہوتی ہے۔ بظاہر ایک جیسے نظر آنے والے لوگ ضروری طور پر ایک جیسی سوچ نہیں رکھا کرتے۔ جہاں لوگ اپنے جیسا نقطہ نظر رکھنے والے لوگوں سے بات چیت کر کے اطمینان محسوس کرتے ہیں وہیں انہیں مخالف نظریات والے لوگوں سے بات کرنے کا بھی تجسس ہوتا ہے۔ ہاں یہاں یہ بات ضروری ہے بات چیت ہاتھا پائی میں تبدیل ہونے کے امکانات کم ہوں۔ لوگ اسی طرح دوسروں کو متاثر کرنے اور اپنے نقطہ نظر کے قریب لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی عمل کے دوران لوگ خود بھی دیگر آپشنز پر غور کرتے ہیں اور متبادل مواقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔

عوامی بحث کے دوران بھی لوگ ان چیزوں کا خیال رکھتے ہیں جو ان کو عزیز ہوتی ہیں اور مختلف آپشنز کا جائزہ لیتے ہوئے ان چیزوں کے مابین موجود قدرتی چپقلش پر بھی غور کرتے ہیں۔ اگر ایسے مباحثوں کو زندگی سے

نکال دیا جائے تو آراء ذاتیات تک محدود ہو کر رہ جاتی ہیں۔ عوامی آراء ختم ہوتی جاتی ہیں اور لوگوں کو یہ سب سیکھنے میں مشکلات بھی پیش آتی ہیں۔

میں نے اس سے پہلے یہ بھی کہا ہے کہ مباحثے صرف خصوصی فورمز میں ہی نہیں ہوتے بلکہ یہ تو روزانہ کے معمول کا حصہ ہوتے ہیں۔ لیکن پھر بھی ایسے فورمز میں خیالات کو کھل کر بیان کرنے کا موقع ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر معاملات پر بحث کے بعد لوگ یہ کہتے سنائی دیتے ہیں 'ہمیں اس پر زیادہ کثرت سے بات کرنی چاہئے' یا 'یہی چیز تو اصل میں جمہوریت ہے۔'

ایک فورم ایسی بات چیت کرنے کے عمل کو پروان چڑھانے کا بھی ذریعہ ہوتا ہے۔ لیکن یہ جمہوریت کا اہم حصہ ہونے کے بجائے کل حصہ نہیں ہے۔ لوگوں کو بہترین فیصلہ سازی کرنے کیلئے ایک ہی معاملے پر کئی دفعہ بحث کرنا پڑتی ہے۔ اسی سے ان کی معاملات کو سلجھانے کی اہلیت بھی بڑھتی ہے۔

'اس کتاب میں جگہ جگہ بحث، عوامی بحث، فیصلہ ساز بحث اور روزمرہ بحث کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ ان سب میں فرق واضح کئے بغیر ان کو سمجھنا مشکل عمل ہو۔
جب لوگ خاص فورم پر معاملات سے متعلق بات کرتے ہیں تو انہیں محسوس ہوتا ہے کہ وہ عام حالات میں معاملات پر اس طرح بات چیت نہیں کرتے جس طرح انہوں نے اس فورم پر کی۔ پہلے ہم نے اس بات چیت کو صرف بحث قرار دیا تھا۔ اسی طرح عدالتیں یا جیوری بھی مباحثے کرتی ہیں۔ ان کی بحث کو عوامی مباحثہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ مگر ان دونوں میں فرق کیا ہے؟ فورم شاید ایک شہری کی دوسرے شہری سے بات چیت تک محدود ہوتے ہیں اور کسی حد تک عوامی بحث کا مرکز بھی ہوتے ہیں۔

عوامی بحث کا مقصد عام طور پر مسائل کا حل سوچنا یا کسی ایشو پر فیصلہ سازی کرنا ہوتا ہے۔ اگر تو کوئی بحث صرف لوگوں کو معلومات دینے کی بجائے فیصلہ سازی کے مرحلے تک جاتی ہو تو اس کو فیصلہ ساز مباحثہ کہا جاسکتا ہے۔

روزمرہ کی بحث کسی فورم تک محدود نہیں ہوتی۔ ایمی گٹمین کا بھی یہی کہنا ہے کہ یہ بحث ہر اس جگہ پر ہو رہی ہوتی ہے جہاں بھی اجتماعی فیصلہ سازی کا عمل جاری ہوتا ہے۔ تاہم یہ بات بھی اہم ہے کہ فورمز میں ہونے والی بحث بھی ایسے معاشرے کو مضبوط کرتی ہے جس کی بنیاد بات چیت پر

کھڑی ہو۔'

اس علم کی تشکیل جس کی ضرورت ہے

اس باب کے پہلے کچھ صفحات میں میں نے بتایا کہ شہری اپنے آپ کو کس طرح آگاہ رکھتے ہیں۔ میں اس موضوع کو مزید آگے بڑھانا چاہتا ہوں کیونکہ 'لوگوں کو معلومات کی فراہمی' پر کافی زور دیا جاتا ہے۔ دراصل بحث اور بات چیت کا حصہ بننے سے ہی عوام معلومات بھی حاصل کرتے ہیں۔ اسی علم کو عملی دانائی کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔ یہی وہ علم ہے جس کی بنیاد پر فیصلہ سازی کی جاتی ہے۔ یہ مقامی حالات سے آگہی سے کچھ بڑھ کر ہوتا ہے۔ مزید برآں یہ ان معلومات سے بھی مختلف ہوتا ہے جس کو ماہرین یا سرکاری ادارے استعمال کرتے ہیں۔

'یونانی لوگ بحث کی بنیاد پر نکلنے والے نتیجے کو فرونیسز کا نام دیتے تھے۔ اس کو آسان الفاظ میں وہ سوچ کہا جا سکتا ہے جو بامقصد گفتگو کے نتیجے میں حاصل ہوتی ہے۔ بعد میں چوتھی صدی عیسوی میں آئیسوکریٹس نے اس عمل کو سائنسی بحث سے الگ قرار دیا اور اس کو عملی دانائی کے ساتھ جوڑا۔ اس کا خیال تھا کہ انسان کے دماغ میں ایسی کوئی صلاحیت موجود ہوتی ہے جس کو وہ سیاسی فیصلوں کے دوران استعمال کرتا ہے۔ یہی قوت سمجھدارانہ اور بیوقوفانہ فیصلوں میں فرق بتاتی ہے۔ یہی فیصلہ سازی کا ہنر عطا کرتی ہے۔'

ماہرین کا عمل اور عوامی علم

ماہرین کی طرف سے استعمال کیا جانے والا علم تکنیکی نوعیت کا ہوتا ہے جبکہ عوام روزمرہ کی عام سی معلومات کی بنیاد پر ہی فیصلہ سازی کرتے ہیں۔ لوگوں کی معلومات تو زندگی کی معمولات اور تجربات کی بنیاد پر ترتیب پاتی ہیں۔ اس کے مقابلے میں ماہرین کے زیر استعمال آنے والا علم محدود اور سائنسی ہوتا ہے۔ عوام کی معلومات کثیر الجہتی ہوتی ہیں اور ان میں مزید اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اس کے علاوہ عوامی معلومات عملی نوعیت کی ہوتی ہیں اور مقامی لوگوں کے حالات سے مطابقت رکھتی ہوتی ہیں۔ دونوں اقسام کے علوم اہم ہوتے ہیں اور دونوں کے اپنے اپنے مقاصد بھی ہوتے ہیں۔

مگر ان میں اتنا زیادہ فرق کیوں ہوتا ہے؟ افسوس کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان دونوں اقسام کے علوم میں ایسا ہی فرق ہے جیسا اعلیٰ اور ادنیٰ میں ہوتا ہے۔ جن لوگوں کے پاس ماہرین والا علم ہوتا ہے وہ دوسرے لوگوں کے خیالات کو جانے بغیر ہی اسے ان پر تھوپنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ وہ سیکھانے کے

درست طریقہ کار سے واقف ہی نہیں ہیں۔

میں ایسا تاثر نہیں دینا چاہتا کہ میرے نزدیک ماہرین کی معلومات اوران کی طرف سے اٹھائے جانے والے اقدامات کی کوئی قدر نہیں۔ میں کسی ایسے تحریک کا حصہ بھی نہیں ہوں۔ اس کے باوجود حقائق اور سرکاری معلومات اپنی اہمیت کے باوجود بعض اوقات عقائد کے ساتھ ٹکراؤ کا باعث بنتی ہیں۔ ایسے عقائد جن کو مقامی لوگ اپنی زندگی کا حصہ سمجھتے ہیں۔ یہ معلومات مسائل کو کم ہی ختم کرتے ہیں کیونکہ یہ معلومات شاید حقیقی مسائل سے متعلق ہوتی ہی نہیں ہیں۔ عوامی بحث کا ایک مقصد یہ طے کرنا بھی ہوتا ہے کہ آخر مسائل ہیں کیا؟ مسائل دراصل ان چیزوں کے مابین پائی جانے والی چپقلش ہوتی ہے اور اس کو حل کرنے کیلئے درست فیصلہ کرنے کی صلاحیت درکار ہوتی ہے۔

ماہرین کے پاس موجود معلومات عموماً نیوٹرل ہوتی ہیں مگر اس کے باوجود سرکاری افسران کے ذہن میں ان کے اپنے بھی کچھ نظریات ہوتے ہیں۔ لہذا اس بات کا امکان موجود ہوتا ہے کہ یہ خیالات ان معلومات پر حاوی ہو جائیں جن کی دراصل سرکاری ملازمین وکالت کر رہے ہوتے ہیں۔ یوں ایسے افسران کی طرف سے تجویز کیا جانے والا تکنیکی حل بھی متاثر ہو سکتا ہے۔ مارتھا ڈیر تھک نے اس میں فرق واضح کرنے کیلئے ایک تحقیق کی اور فلاحی امور سے متعلق پالیسی کا جائزہ لیا۔ انہوں نے دیکھا کہ ماہرین یا سرکاری افسران کی طرف سے قوانین اور معلومات کو استعمال کرتے ہوئے کسی خاص نظریے کی حمایت نہیں کی جاتی۔ تمام معاملات کے ساتھ یکساں سلوک کیا جاتا ہے۔ لوگ اس صورتحال سے فائدہ تو اٹھاتے ہیں مگر وہ مقامی نظریات اور حالات کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے مطابق کارکردگی دکھائے جانے کی بجائے توجہ دیا جانا زیادہ ضروری ہوتا ہے۔ ان کے خیال میں عام فہم باتیں قوانین اور ضابطوں سے زیادہ اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔

> **'عوامی علم یا عملی دانائی نہ صرف ماہرین کے علم سے مختلف ہوتی ہے بلکہ اس کا ذریعہ بھی کچھ اور ہوتا ہے۔ لوگوں کو کیسے کام کرنا چاہئے؟ یہ بحث ومباحثے میں سیکھا جا سکتا ہے۔ جس میں انسانی عقل کا استعمال کیا جاتا ہے۔ یوں یہ کہا جا سکتا ہے کہ عقلی دانائی تو دراصل سماجی تجربات کی پیداوار ہوتی ہے۔ اس مقابلے میں ماہرین کے پاس موجود معلومات نہ تو اس طریقے سے پیدا ہوتی ہیں اور نہ کوئی بہتر فیصلہ سازی کرنے میں مدد دیتی ہیں۔'**

کیا عوامی بحث مباحثے سے کوئی اثر پڑتا ہے؟

این آئی ایف فورمز میں شامل ہونے والے اکثر لوگوں سے پوچھا جاتا ہے کہ وہ کیا سمجھتے ہیں ان کی بحث

سے کوئی فرق بھی پڑے گا؟ کیا اس کے اثرات موجودہ سیاسی نظام پر پڑیں گے؟ اس سوال سے ظاہر ہو رہا ہے کہ عوام کی بات چیت کی کامیابی کو ریاست پر پڑنے والے اثر سے جوڑا جا رہا ہے۔ یا پھر دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس سوال سے یہ تاثر ملتا ہے کہ اس بات چیت کے بعد معاشرے میں کیا اثر نظر آتا ہے اس سے متعلق جاننے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس کے مقابلے میں اگر کوئی تبدیلی اداروں میں رونما ہو تو اس کی ضرور اہمیت تصور کی جاتی ہے۔ اگر عوام سے صرف سرکاری مشینری سے متعلق ہی سوالات پوچھے جاتے ہیں اور خود عوام کی کوئی قدر و منزلت نہیں تو یقیناً ان کی طرف سے سرانجام دی جانے والی سماجی خدمات کی بھی کوئی وقعت نہیں ہو سکتی۔

مزید یہ کہ جو لوگ عوامی بحث و مباحثے کے نتائج اتنی جلدی پالیسیوں پر دیکھنا چاہتے ہیں انہیں دراصل وہ طریقہ کار ہی معلوم نہیں جس کے ذریعے پالیسی سازی کی جاتی ہے۔ پالیسی سازی درحقیقت ایک سست رو اور مرحلہ وار عمل ہے جس میں کئی دیگر طاقتیں بھی شامل ہوتی ہیں۔

عوامی مباحثوں کے پالیسیوں پر اثرات سے متعلق تحقیقات کا تذکرہ بینجمن پیج اور رابرٹ شاپیرو کی ریسرچ 'دی ریشنیل پبلک' میں کیا گیا ہے۔ پچاس سال کی مسلسل تحقیق کے جائزے میں انہوں نے یہ بات نوٹ کی کہ اس دوران مختلف پالیسی معاملات پر عوامی رویہ مجموعی طور پر یکساں اور قابل توجیہہ تھا۔

اس ریسرچ میں یہ بات سامنے آئی کی عوامی سوچ میں یکسانیت پائی جاتی ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان سالوں کے دوران رائج رہنے والی پالیسیاں کسی حد تک عوامی توقعات کیلئے کام کر رہی تھیں۔ یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ عوامی رویوں کے پیچھے کوئی نہ کوئی وجہ چھپی ہوئی تھی۔ مثال کے طور پر لوگ اس وقت نوکریاں دلائے جانے پر زیادہ رقوم خرچ کرنے کی حمایت کرتے ہیں جب معاشرے میں بے روزگاری کی شرح بڑھ رہی ہو۔ دوسری جانب عوامی توقعات بھی حالات کے ساتھ ساتھ بہتر ہونے کے علاوہ یکساں بھی رہیں ہیں۔ پالیسیوں سے متعلق عوامی توقعات اور ردعمل اس قدر یکساں رجحان کا حامل کیوں ہے؟ پیج اور ان کی ساتھی کے مطابق اس کی وجہ معاشرے میں موجود سکون اور بحث پسندانہ رواج ہے۔

'بالآخر امریکی عوام کو ہی فیصلہ کرنا ہوگا۔ کوئی بھی صدر عوامی حمایت اور کانگریس کی مدد کے بغیر اپنی پالیسیوں کو نہیں چلا سکتا۔ یہ بات بار بار درست ثابت ہو چکی ہے'۔۔۔ ڈین رسک

ڈین یانکلووچ نے مختلف انتخابی مہمات کے خاتمے پر عوامی مباحثوں کی وجہ سے عوامی رویے میں تبدیلی کو محسوس کیا۔ انہوں نے اس کا تذکرہ اپنی تحقیق میں بھی کیا۔ عوام میں پائی جانے والی بے ترتیب رائے ایک دن مستقل فیصلے کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انتخابی امیدواروں سے متعلق عوامی رائے جو پہلے عمومی قسم کی

تھی اب زیادہ تو جیہہ پسندانہ ہوتی جا رہی ہے۔ یہ پیشرفت شاید روزمرہ کے بحث ومباحثے کا نتیجہ ہی ہو۔

اگر ینکلووچ کی تحقیق کو پیج اور شاپیرو کی ریسرچ کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو میں ایک بار پھر یہ بات کہنے پر مجبور ہوں کہ عوام عقل کل نہیں ہوتے۔ اور میں ایسا کچھ کہنا بھی نہیں چاہ رہا۔ ایک بہترین فیصلہ وہی ہوتا ہے جس کو عوام اپنے حق میں بہتر تصور کریں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ آج درست دکھائی دینے والا فیصلہ آنے والے وقت میں غلط ثابت ہو۔ عوامی رائے ہرگز خدائی نقارہ نہیں ہوتی۔ اس کے باوجود عوامی مباحثے فائدہ مند ہوتے ہیں اور اس سے عوام میں پہلے سے موجود بات چیت کرنے کی صلاحیت میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ اور یہ بات کسی حد زیادہ قابل عمل اور موثر ہوسکتی ہے کہ پہلے تو مباحثے کا رواج پیدا کیا جائے اور بعدازاں اس میں بہتری لائی جائے۔

بحث کی ضرورت کب ہوتی ہے؟

تمام تر فوائد کے باوجود بحث ہرگز تمام تر مسائل کا حل نہیں ہے۔ ہر صورتحال میں فیصلہ سازی کیلئے یہ عمل ضروری نہیں ہوتا۔ فیصلہ سازی کے عمل میں دیگر بھی کئی چیزیں مددگار ثابت ہوسکتی ہیں۔ جیسا کہ ووٹ ڈالنا یا متعلقہ ذمہ داروں سے مذاکرات کرنا۔ عوامی مباحثوں پر مشتمل فیصلہ سازی صرف مخصوص معاملات میں ہی کی جانی چاہئے۔

☆ مباحثے اس صورتحال میں مددگار ثابت ہوتے ہیں جب عوام کو مسائل کے بارے میں تو علم ہو مگر وہ اس بارے میں واضح نہ رکھتے ہوں کہ اس معاملے کو اتنی دلچسپی دی جانی چاہئے یا نہیں۔

☆ بحث کے عمل میں عوام اس قیمتی چیز کا تعین کر سکتے ہیں جس کا وجود خطرے میں ہو۔ کچھ معاملات تو اس کا تکنیکی حل قبول کرنے یا رد کرنے سے حل ہو سکتے ہیں۔ ان پر بحث کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ نتائج مکمل طور پر تکنیکی نوعیت کے ہوں۔ لیکن ساتھ ساتھ ہی ان کا اخلاقی جواز بھی موجود ہو۔

☆ عوامی بحث اس وقت بھی ضروری ہوتی ہے جب کسی معاملے پر ابھی حتمی فیصلہ نہ کیا گیا ہو۔ ایسے معاملات جن پر کوئی نتیجہ تو نکالا جا چکا ہو مگر نتیجہ نکالنے والے اس پر عوامی حمایت بھی چاہتے ہوں۔ اس عمل میں اس نتیجے کے حق میں بات کرنے والے موثر انداز میں اس فیصلے کے فوائد پر روشنی ڈالتے نظر آ سکتے ہیں۔

☆ عوامی بحث قومی پالیسی کے معاملات میں تو مددگار ثابت ہوسکتی ہے لیکن انتظامی معاملات اس عمل کا کوئی فائدہ نہیں ہوسکتا۔ کچھ چیزیں کچھ اداروں کے آئینی فرائض میں شامل ہوتے ہیں، ان کے اس حق کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم اس طرح کے معاملات پر بات چیت سے فیصلہ ساز اداروں یا ان ذمہ داروں کو ضرور عوامی رائے کے بارے میں آگہی مل سکتی ہے۔ یوں یہ عمل ان افسران کے لئے مددگار

ثابت ہوسکتا ہے۔

☆ عوامی مباحثے کسی پالیسی کی تشکیل کے ابتدائی مراحل میں بھی سرکاری عہدیداروں کیلئے مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہ اس صورت میں ہرگز منعقد نہیں کئے جانے چاہیئے جب معاشرے میں دراڑ پیدا ہونے کا خدشہ لاحق ہو۔

☆ ایسے معاملات بھی عوامی بات چیت کیلئے پیش نہیں کئے جانے چاہئیں جن میں کئی دوسرے ایشوز بھی شامل ہوں۔ مثلاً ایسے معاملات جو ساری شعبہ صحت عامہ میں اصلاحات لانے سے متعلق ہوں۔ یہ ایک وسیع موضوع ہے اور کئی دوسرے بڑے بڑے معاملات اس بحث کا حصہ بن سکتے ہیں۔

اس بحث کو سمیٹنے کیلئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ عوامی بحث ایسے معاملات پر کی جانی چاہیئے جن کو عوامی نقطہ نظر کے مطابق ترتیب دینے کی ضرورت ہو۔ یہ معاملات اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب لوگوں میں اپنے ساتھ پیش آنے والے حالات کے سبب پریشان کن لہر دوڑ جاتی ہے۔ اور پھر لوگ نہ صرف اس مسئلے سے متعلق عدم اتفاق کرتے ہیں بلکہ اس کے حل سے متعلق بھی کوئی واضح خیال نہیں رکھتے۔

☆☆☆☆☆

باب ہشتم

مباحثوں کو پروان چڑھانے کیلئے مسائل کو پیش کرنا

ایک بہترین معاشرے کے قیام اور حکومتی پالیسیوں کی کامیابی کیلئے بہترین قوت فیصلہ کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ جس کیلئے عوامی مباحثے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب یہاں سوچنا یہ ہوگا کہ وہ ایسی کونسی چیز ہوگی جو اچانک وقوع پذیر ہونے والے معاملات پر فوری عوامی بحث کا رجحان پیدا کردیں؟ یہاں تک کہ اگر پیج اور شاپیرو کی یہ بات بھی مان لی جائے کہ مباحثوں کے نتائج کچھ وقت گزرنے کے بعد ظاہر ہوتے ہیں، پھر بھی کچھ معاملات اس قدر فوری نوعیت کے ہوتے ہیں کہ ان پر بحث میں تاخیر کرنے کا مطلب مکمل طور پر بحث نہ کرنا ہی ہوتا ہے۔

معاملات پر عوامی بحث ہوگی یا نہیں؟ اس بات کا ان معاملات کو پیش کئے جانے کے انداز سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ یہ انداز ان مسائل کو حل کرنے کے ممکنہ طریقوں اور اس ضمن میں عائد ہونے والی سماجی ذمہ داری پر بھی مبنی ہونا چاہئے۔ پیش کئے جانے والے ممکنہ طریقے غیر واضح بھی ہو سکتے ہیں، یہ مسائل کو واقعی حل کردیں یہ ضروری نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر محکمہ صحت میں زیادہ اخراجات سے بچنے کیلئے عوام میں احتیاطی تدابیر پر عمل کرنے کے رجحان کی ترویج پر زور دیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح سستا طریقہ علاج متعارف کروانے کا مجوزہ حل زیادہ قیمتیں مقرر کرنے پر پابندی عائد کرنا بھی ہوسکتا ہے۔

معاملات کو کسی خاص انداز میں پیش کرنے کا عمل ہر وقت ہی جاری رہتا ہے۔ حکومت، سرکاری افسران، لابیاں اور مفاد پرست ٹولے ہر وقت کچھ معاملات کو ایک خاص رنگ دینے میں مصروف رہتا ہے۔ انہی میں سے کچھ معاملات ایسے انداز میں بھی پیش کئے جاتے ہیں کہ ان پر عوامی بات چیت نہ کی جاسکے۔ مثال کے طور کوئی ایسا کرنے کیلئے یہ کہتا ہوا نظر آسکتا ہے 'ہمارے پاس ایک حل ہے جس پر فوری طور پر عمل کیا جانا چاہئے، اس کے سوا کوئی قابل غور آپشن ہی نہیں ہے۔' یا پھر 'صرف میری دی گئی تجویز ہی بہترین ہے، اس کو تھوڑی سی اخلاقیات رکھنے والا ہر انسان قبول کرے گا'۔ بعض اوقات کسی مسئلے کے حل کیلئے دو بالکل الٹ حل پیش کرنے سے بھی کئی معاملات جنم لے سکتے ہیں۔ حالانکہ ایسے معاملات بہت کم ہوتے ہیں جن کیلئے ایسے حل تجویز کئے جاسکیں۔

کسی بھی معاملے پر مباحثے کی حوصلہ افزائی کرنے کیلئے ضروری ہے کہ اس کے حل کیلئے متعدد آپشنز دیئے جائیں اور یہ سب قابل توجیہہ ہوں۔ معاملات کو پیش کرنے کے اس انداز سے لوگ آپ کے دیئے گئے آپشنز تک ہی محدود نہیں رہتے بلکہ بات چیت آگے بڑھتی جاتی ہے۔ یہ انداز تو صرف بات چیت کے آغاز کا باعث

ہی بنتا ہے۔

عوامی مباحثہ کا آغاز کرنے کیلئے فیصلہ سازی کے طریقہ کار میں کچھ چیزیں موجود ہونی چاہئیں۔ جیسا کہ اس میں کسی مسئلے کوحل کرنے کے تمام اصولی آپشنز شامل کئے جانے چاہئیں۔ یہ مواقع ان چیزوں کو ذہن میں رکھ کر ترتیب دیے جانے چاہئیں جو عوام کو عزیز ہوتی ہیں اور جنہیں وہ کبھی بھی کھونا نہیں چاہتے۔ کیونکہ لوگوں کی عزیز چیزوں کی فہرست قدرے لمبی ہوتی ہے اسی لئے مسائل کو حل کرنے کیلئے کئی ایک طریقہ کار ہو سکتے ہیں۔ جن پر غور کی ضرورت ہوتی ہے۔ نیشنل ایشوز فورمز پر تحقیق میں یہ بات سامنے آئی کہ عموماً کسی بھی معاملے پر لوگوں کے تین سے چار تحفظات ضرور ہوتے ہیں۔ یوں اس مسئلے کے حل کیلئے اتنے ہی آپشنز بھی دستیاب ہوتے ہیں۔

ایک اور بات بھی مدنظر رکھی جانی چاہئے کہ پیش کئے جانے والے تمام ہی آپشنز واضح ہوں، یعنی ان میں متعلقہ لوگوں کا کردار متعین کر دیا گیا ہو۔ حکومت کیا کرے گی؟ اس کے اداروں کا کیا کام ہوگا؟ اور عوام خود کیا فرائض سرانجام دیں گے؟ یہ سب واضح ہونا چاہئے۔ کسی بھی بحث کو سودمند بنانے کیلئے ضروری ہے کہ اس میں فرضی اور غیر حقیقی مواقع یا حل پیش نہ کئے جائیں۔ ورنہ ساری بات چیت فلاں کو یہ کرنا چاہئے اور فلاں کو یہ تک محدود ہو کر رہ جائے گی۔

یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ تمام آپشنز کو ایمانداری سے بیان کیا جائے۔ ہاں اس میں یہ بات شامل کی جا سکتی ہے کہ کسی خاص تجویز کے بارے میں عوام کیا سمجھتے ہیں۔ نیوروسائنس کے ماہرین کہتے ہیں کہ کسی تجویز کے بارے میں موجود انسانی احساسات اس کے توجیہی جائزے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ احساسات کے بغیر صرف توجیہی جائزے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ احساسات کے ساتھ ٹکراؤ پیدا کرنے والی تجاویز معاشرے میں بگاڑ کا باعث بنتی ہیں۔ نیشنل ایشوز فورمز کے معاملے میں ایسا نہیں ہوتا تھا، یہاں تک ایڈز جیسے سنجیدہ معاملے پر بھی سب مجوزہ باتوں پر بحث کی گئی۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ ایسی صورتحال ہر دفعہ بات چیت کا باعث بنے۔ ایک صحت مند طریقہ کار اور انداز ہی مباحثہ کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔

اگر تمام آپشنز کو ایمانداری سے پیش نہ کیا جائے تو ممکن ہے کہ کچھ لوگوں میں تاثر پیدا ہو جائے کہ انہیں محض استعمال کیا جا رہا ہے۔ ایمانداری کا عنصر پیدا کرنے کیلئے کسی بھی طریقہ کار کے فوائد اور نقصانات دونوں ہی بیان کر دینے چاہئیں۔ یہاں بھی فوائد اور نقصانات مالی صورتحال کی بجائے عوامی ترجیحات کو دیکھ کر ترتیب دیئے جانے چاہئیں۔

چونکہ مباحثہ عموماً انہی چیزوں سے متعلق ہی ہوتا جو لوگوں کیلئے عزیز ہوتی ہیں لہذا پیش کئے جانے والے فوائد اور نقصانات بھی مکمل طور پر واضح ہونے چاہئیں۔ لوگوں کو یہ بتایا جانا چاہئے کہ کونسا طریقہ کار استعمال کرنے

سے ان کی فلاں فلاں چیز بچ سکتی ہے اور کون کون سی چیز کا وجود خطرے میں پڑ سکتا ہے۔ کیا یہ آپشن استعمال کرنا زیادہ محفوظ ہوگا یا زیادہ خطرناک؟ دوسرے الفاظ میں کسی بھی آپشن سے متعلق لوگوں کی عزیز چیزوں کے مابین پائے جانے والے نازک تعلق کو خیال میں رکھنا چاہئے۔

اکثر اوقات لوگ اس نازک تعلق کو نظر انداز کر رہے ہوتے ہیں لہذا یہ ضروری ہے کہ انہیں اس سے متعلق ایمانداری سے آگاہ کر دیا جائے۔

کیونکہ پہلے ہی سے مسائل کے شکار معاشرے کو مزید پریشانی سے دوچار کرنا کوئی عقلمندی نہیں۔ اس صورتحال میں اگر لوگوں کے تحفظات کو نظر انداز کر بھی دیا جائے تو وہ کچھ وقت بعد معاشرے کے کسی دوسرے حصے میں دوبارہ نمودار ہو جاتے ہیں۔ اور پھر وہی صورتحال پیدا ہو سکتی ہے جس کا میں پہلے تذکرہ کر چکا ہوں۔ مختلف حل تجویز کرنے والے اس انداز میں اپنے اپنے طریقہ کار کی وکالت کرتے ہیں کہ معاشرہ تقسیم در تقسیم ہوتا چلا جاتا ہے۔ لہذا یہ ضروری ہے کہ پہلے ہی درست وقت پر نہ صرف ان باتوں کی نشاندہی کی جائے بلکہ انہیں مباحثے کا حصہ بھی بنایا جائے۔ اسی طرح یہ مسائل ختم ہو جائیں گے اور کسی ایک بات پر تمام لوگ متفق بھی ہو سکیں گے۔ ایسی چپقلشوں کو واضح انداز میں پیش کر کے ہی اصل مسئلے کی نشاندہی اور اس کے حل کی بات کی جا سکتی ہے۔ اور مباحثہ ہی ان مسائل کے حل کا تعین کرتا ہے۔

معاملات کو ایک خاص انداز میں پیش کر کے ان پر بحث کرنے کا مقصد دراصل یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو بات چیت کے اس مرحلے سے آگے لے جایا جائے جہاں سے مسئلے کے حل کا آغاز ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس مرحلے تک ابھی اتفاق رائے پیدا نہ ہوا ہو مگر پھر بھی یہ سود مند ہوتا ہے۔ یوں یہ بات چیت اس معاملے پر کسی حد تک یکسانیت پیدا کرنے کا باعث ضرور بنتی ہے۔ یہ یکسانیت مکمل طور پر نہیں ہوتی۔ یہ صرف کسی مسئلے کے حل کیلئے کئے جانے والے عملی اقدامات تک ہی محدود ہوتی ہے۔ یہ اقدامات ایسی صورتحال سے گھرے ہوتے ہیں جس کی اجازت عوام ہرگز نہیں دیتے۔ مثال کے طور پر نیشنل ایشوز فورمز میں انٹرنیٹ پر نفرت انگیز مواد کی اشاعت پر عوام نے کچھ رکاوٹوں کی تو حمایت کی مگر انہوں نے حکومتی پابندی کی انتہائی سختی سے مخالفت کی۔

ایسے مباحثے میں ایک یہ خوبی ہونا بھی ضروری ہوتا ہے کہ یہ ہمیں آگہی دے کہ ہم نہ صرف آپس میں مختلف ہیں بلکہ ہم تو اپنی ذات میں بھی ایسے ہی ہیں۔ ہم کئی معاملات پر نہ صرف ذاتی طور پر بلکہ معاشرتی لحاظ سے بھی بٹے ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ہر کسی کو عزیز چیزیں نہ صرف مختلف ہوتی ہیں بلکہ ان میں باہمی چپقلش بھی موجود ہوتی ہے۔

جب ہم اپنے آپس کے اختلافات کو تسلیم کر لیتے ہیں تو ہم دوسرے کے نقطہ نظر کو بھی بہتر انداز میں سننے

لگتے ہیں۔ جب تک ہم خود کو مکمل طور پر صحیح تسلیم نہیں کرتے، ہم کسی دوسرے کی رائے کو غور سے سننے کو ترجیح دیتے ہیں۔اسی طرح کے طریقہ کار جو مسائل کے حل میں مددگار ہوتے ہیں، کا تذکرہ میں اگلے باب میں بھی کروں گا۔

جہاں افسران معاملات کو انداز میں بیان کر سکتے ہیں تو عوام بھی معاملات کو اپنے عمومی طریقہ کار سے پیش کر سکتے ہیں۔تاکہ بحث کا آغاز کیا جا سکے۔ عام طور مقامی مسائل کو اس طرح پیش کئے جانے کے زیادہ امکانات ہوتے ہیں۔اس طرح کی کئی مثالیں پہلے ہی پیش کی جا چکی ہیں۔

جیسے جیسے عوام بات چیت کرتے ہیں انہیں احساس ہونے لگتا ہے اس سے پہلے وہ جس انداز سے معاملات کو پیش کرتے رہے ہیں وہ غلط تھا۔مثال کے طور پر مسائل کو نام دینے کا معاملہ تو مسائل کے حل کیلئے متفقہ طریقہ کار پر بحث کے دوران جاری ہی رہتا ہے۔ بلکہ دراصل تو مسائل کو بار بار دوبارہ سے نام دینا اور معاملات پر نظر ثانی کرنا تو بحث کا ایک ضروری حصہ ہی ہے۔

کسی معاملے کو کس انداز میں پیش کیا جانا چاہئے؟

مباحثے کی ترویج کیلئے کسی معاملے کو پیش کئے جانے کا انداز کچھ اس طرح کا ہونا چاہئے:

☆ ایسی چیزیں جن سے متعلق لوگوں کو خدشات لاحق ہوں، ان سے متعلق مجوزہ حل میں واضح طریقہ کار موجود ہو۔ مجوزہ حل بیک وقت عقلی اور عوامی ترجیحات کے لحاظ سے درست ہو۔

☆ تمام آپشنز کے ممکنہ نقصانات اور فوائد واضح انداز میں بیان کئے جائیں۔ایسا کوئی آپشن نہیں ہونا چاہئے جو دیگر مواقعوں کو آپس میں گڈمڈ کر سکتا ہو۔جیسا کہ 'تمام جوابات درست ہیں'۔ کیونکہ اس کی وجہ سے معاملات کے مابین موجود چپقلش اور اختلافی نقطہ نظر نظرانداز ہو سکتا ہے۔

☆ مباحثے کے بعد طے پانے والے مجوزہ حل بھی واضح طور پر بیان کئے جانے چاہئیں۔ان کو بیان کرتے ان کی مالی وقعت کی بجائے لوگوں سے جڑے معاملات میں ان کی اہمیت کو بھی بیان کرنا چاہئے۔

☆ مسائل کے حل کیلئے کام کرنے والوں میں معاشرے کی اجتماعیت کا عنصر موجود ہونا چاہئے۔نہ کہ لوگوں کا تذکرہ انفرادی حیثیت میں کر کے کام نمٹا دیا جائے۔اس ضمن میں حکومت، سرکاری اداروں اور غیر منافع بخش سماجی تنظیموں کے کردار کو بھی بیان کیا جانا چاہئے۔

☆ ہر آپشن کو بہترین حل کے طور پر پیش کیا جانا چاہئے۔مگر ساتھ ہی اس کے منفی پہلو بھی مکمل ایمانداری سے بیان ہونے چاہئیں۔ یہ چیز لوگوں کو نیوٹرل ہو کر معاملات کا جائزہ لینے کا موقع فراہم کرتی ہے۔

☆ بحث میں غیر مقبول مثبت نقاط کو بھی شامل کیا جانا چاہئے۔

☆ کسی ایک آپشن کے فوائد دوسرے کے نقصانات نہیں ہو سکتے۔لہذا ہر آپشن کو اس کے انفرادی فوائد اور نقصانات کی روشنی میں دیکھا جانا چاہئے۔ ورنہ معاملات کو پیش کرنے کا انداز ہی بحث میں رکاوٹ کا

باعث بن سکتا ہے۔

☆ کسی بھی معاملے کو پیش کرنے کا انداز ایسا نہیں ہونا چاہئے جس سے روایتی مباحثے کا آغاز ہو جائے اور برسوں سے جاری طریقہ کار کے مطابق بات چیت چلنے لگے۔ اس کی بجائے کسی نئے طریقے کا سہارا لینا چاہئے۔ اس ضمن میں ماہرین میں رائج طریقہ کار سے بھی اجتناب ہی برتنا چاہئے۔ اس کے مقابلے میں ہمارے اپنائے جانے والے طریقہ کار میں عوامی رنگ نظر آنا چاہئے۔ اسے ایسی جگہ سے شروع ہونا چاہئے جہاں سے اسے عام لوگ شروع کریں گے۔

☆ مباحثے کا موثر انداز ہمیشہ ہی سامعین کو کسی مناسب حل کے بھی منفی پہلوؤں سے آگہی دے کر انہیں اس کے ثمرات سے بھی آگاہ کر دیتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ انہیں مجوزہ آپشنز سے متعلق واضح اور مکمل معلومات دی جائیں۔ یہ حل ایسے ہونے چاہئیں کہ انہیں ترک کرنے کی کوئی گنجائش ہی موجود نہ ہو۔ کیونکہ انہی کے ذریعے سیکھنے کے رجحان کا آغاز ہونا چاہئے۔

'میں مباحثے کو پیش کرنے کے انداز پر ضرورت سے زیادہ زور نہیں دینا چاہتا۔ اس ضمن میں لکھی جانے والی کتابیں بھی کسی مسئلے کو تو سادہ نہیں کر سکتیں بلکہ صرف کسی پیچیدہ صورتحال کو اچھی طرح بیان کرنے کا گر ہی سکھاتی ہیں۔ یوں یہ 'انداز' ہی معاملات کے مابین چپقلش کو بیان کرکے نا ممکن کو ممکن بنا دیتی ہیں۔ دراصل معاملات کو حل نہ کر سکنا ہی مسائل کے حل کی لگن پیدا کرتا ہے اور یوں انسان سیکھنے کے عمل میں داخل ہوتا ہے جس کے نتیجے میں عملی اقدامات اٹھائے جا سکتے ہیں۔'

عوامی شمولیت کے نتائج

ایک ایسے طریقہ کار کو ترتیب دینا جس کا آغاز کسی مسئلے کو ایسا نام دینے سے ہوتا ہے جو اس سے متعلق عوامی تحفظات کی نشاندی کر سکے، ایسے اداروں کیلئے ایک بہترین نتیجہ ہوتا جو معاشرے میں لوگوں کی شمولیت کیلئے کوشاں ہوتے ہیں۔ ایسے اداروں کو صرف عوامی حمایت کی ضرورت ہو سکتی یا قانونی جواز کی، یا پھر انہیں قانونی طور پر موجود حقوق کے استعمال تک محدود رہنا ہوتا ہے، یا انہیں معاشرے میں عوامی شمولیت کے معیار کو بلند کرنا مطلوب ہوتا ہے۔

کیٹرنگ فاؤنڈیشن کا لوگوں کی شمولیت سے متعلق نظریہ اس مشاہدے سے متاثرہ ہے جس میں لوگ مسائل کو مناسب نام دیتے ہیں اور انہیں کسی مباحثے میں پیش کرنے کیلئے تیاریاں کرتے ہیں۔ ہمارا پہلا نکتہ یہ ہے

کہ لوگوں کو مکمل طور پر لاتعلق خیال کئے جانے کی بجائے انہیں نظام میں شامل کئے جانے کیلئے اقدامات کرنے چاہئیں۔اس کی شروعات ایسے معاملات سے کی جاسکتی ہے جس میں لوگ پہلے ہی کھل کر شامل ہوتے ہیں۔یوں انہیں ان کی ذات سے نکال کر سیاست کی طرف لانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔اسی نکتے پر عمل کیلئے ہمیں ایسے مقامات کا انتخاب کرنا چاہئے جہاں لوگ پہلے ہی جارہے ہوں نہ کہ انہیں خصوصی مقامات پر بلایا جائے۔اس طرح کا رابطہ عوام کے ساتھ ایک عمومی قسم کا تعلق پیدا کرتا ہے۔

بدقسمتی سے اکثر ادارے ایسی کوششوں کا آغاز ایک ایسے مقام سے کرتے ہیں جہاں وہ عوام کو اپنی طرف سے مسائل کو دیئے گئے ناموں سے متعارف کرواتے ہیں۔پھر مسائل کو سمجھنے اوران کے حل کیلئے کوشش کا طریقہ کار بھی وہی بتاتے ہیں جو انہوں نے تیار کر رکھا ہوتا ہے۔میں ایک بار پھر کہنا چاہتا ہوں کہ ایسی کوششیں مقبولیت تو حاصل کرسکتی ہیں مگر حقیقی طور پر ذمہ دار اور نظام میں حصہ دار شہریوں کو سامنے لانے میں ناکام رہتی ہیں۔

ہمارا ادارہ یہ بات بھی بخوبی جانتا ہے کہ عوام کوئی بے جان چیز نہیں ہیں، نہ ہی یہ کوئی ٹیلی فون ڈائریکٹری میں لکھے ہوئے حروف ہیں۔جب لوگوں کو منصوبوں میں شامل کیا جاتا ہے تو وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچتے ہیں۔عوام ایک دوسرے سے ملتے ہیں، وہ آپس میں مل جل کر کام کرتے ہیں۔یوں عوام کو ایک ساکن چیز کی بجائے ہر دم بدلتی ہوئی طاقت قرار دیا جانا چاہئے۔عوام کو بلب کی بجائے بجلی سمجھا جانا چاہئے۔عوام بالکل بجلی کی طرح ہی سیاسی انرجی کا ذریعہ ہوتے ہیں۔اسی طرح عوام کی نمائندگی بھی کسی ایک شخص یا گروہ کی طرف سے نہیں کی جاسکتی۔

اس سوچ کا مقصد یہ ہے کہ عوامی شمولیت کے دوران یہ عمل صرف انفرادیت تک ہی محدود نہیں رہنا چاہئے بلکہ مختلف سماجی منصوبوں کا بھی آپس میں تعلق قائم ہو جانا چاہئے۔فلاحی منصوبوں پر کام کرنے والے ادارے اور تنظیمیں اگر عوامی شمولیت سے کام کریں تو ان کی طرف سے کئے جانے والے کاموں میں بہتری آسکتی ہے۔انہیں سماجی حمایت حاصل ہوتی ہے اوران کا کام موثر ہوتا جاتا ہے۔اس پر مزید بات اگلے باب میں کی جائے گی۔

فی الحال میں اپنی بات کو قدیم فلسفیوں کے اس فعل تک ہی محدود کرنا چاہتا ہوں جس کو انہوں نے 'سیاست' کا نام دیا ہے۔عوام مختلف تو ہیں مگر ہم سے الگ نہیں ہیں۔یہ ہمارے درمیان بھی موجود ہیں اور ہماری ذات کا بھی حصہ ہیں۔ہم قدرتی طور پر سیاستدان تو نہیں ہیں مگر ہماری اپنی روح میں سیاسی چیزیں ضرور ہیں۔ہماری ذاتی زندگی میں بھی سیاسی پہلو موجود ہوتا ہے جس کا تعلق اس بات سے ہوتا ہے کہ 'ہم دوسروں کے ساتھ کیا کرتے ہیں؟' مزید یہ بھی کہ ہر شخص کی زندگی اس قسم کے مواقع سے بھری پڑی ہوتی ہے جن سے فائدہ اٹھا کر وہ معاشرے میں بڑی تبدیلی رونما کرسکتا ہے۔

☆☆☆☆☆

باب نہم

معاشرے میں موجود مواقع

اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ عام لوگوں کو منصوبوں میں شامل کرنا دراصل انہیں اچھا شہری بنانا ہے اور آپس میں مل جل کر کام کر کے عوام اپنے مسائل سے نمٹ کر ایک بہتر معاشرہ قائم کر سکتے ہیں، تو ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسا ممکن کیسے ہوسکتا ہے؟ زاویئر ڈی سوزا برگس کا خیال ہے کہ اس سوال کا جواب بھی معاشرے کے اندر ہی موجود ہوتا ہے۔ میرے خیال میں ان کا کہنا بالکل درست ہے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ معاشرے کے اندر ہی وہ وہ صورتحال بھی موجود ہوتی جو انہیں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر نہ چلنے کی ترغیب دیتی ہے۔ لوگوں میں اس بات پر بھی اختلافات ہوتے ہیں کہ دراصل ان کے مسائل ہیں کیا؟ اور سب سے بڑی مصیبت تو وہ اختلافات ہوتے ہیں جو مسائل کے مجوزہ حل پیش کرنے پر سامنے آتے ہیں۔ پھر عوام یہ بھی سمجھتے ہیں کہ ان کے پاس وہ وسائل ہی موجود نہیں ہیں جن سے کوئی تبدیلی لائی جا سکے۔ اس کے علاوہ عوام بیک وقت کئی ایک منصوبوں پر کام شروع کر دیتے ہیں جو مختلف سمتوں میں چل رہے ہوتے ہیں۔ یوں ان کیلئے ایک سمت متعین کرنا ہی مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی غلطیوں سے سیکھنے سے کتراتے ہیں، نتیجتاً سماجی کام کرنے کیلئے درکار انرجی کم ہوتی جاتی ہے۔ اور منصوبے تکمیل کے مراحل کرنے سے پہلے ہی ختم ہو جاتے ہیں۔ یہ تمام امور دراصل وہی مسائل ہیں جو جمہوریت کے سبب پیدا ہوتے ہیں۔

جب میں لفظ 'معاشرہ' استعمال کرتا ہوں تو میری مراد ایک خاص جگہ پر رہنے والے لوگ ہوتے ہیں جو کام کرتے ہیں اور اپنے خاندان پالتے ہیں۔ یہ گاؤں، قصبوں اور شہروں کی صورت میں ہو سکتے ہیں۔ یہ معاشرے دراصل ایسے لوگوں کا مجموعہ ہوتے ہیں جن میں کئی باہمی اختلافات موجود ہوتے ہیں۔ ان کے مسائل اور ان کیلئے تجویز کئے جانے والے حل تک مختلف ہوتے ہیں۔ یوں کئی نکاط کے لحاظ یہ گروہ آپس میں مختلف ہیں۔

معاشروں کی کئی اور اقسام بھی ہو سکتی ہیں، جن میں چند ایک میں ہم بھی رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر کچھ معاشرے باقاعدہ طور کسی جگہ نہیں پائے جاتے بلکہ یہ انٹرنیٹ پر پائے جاتے ہیں۔ لیکن ہماری بحث اول الذکر معاشروں تک ہی محدود ہے۔ کیونکہ ایسے معاشروں میں لائی جانے والی تبدیلی ہی دوررس نتائج مرتب کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اور یوں عام لوگوں کو، ان کے بچوں کو تعلیم، صحت اور قدرتی آفات کی صورت میں پیش آنے والی مصیبتوں کا تدارک کیا جا سکتا ہے۔

’جمہوریت کا آغاز ہر صورت اپنے گھر سے ہونا چاہئے، اوراس کے بعد اسی قریبی معاشرے میں مرکوز کیا جانا چاہئے‘۔۔۔جان ڈیوی

یہ معاشرے باہر کی دنیا سے مکمل طور پر لاتعلق نہیں ہونے چاہئیں۔ان میں پیدا ہونے والی تبدیلی ایک معاشرے سے دوسرے اور قریبی علاقوں تک پھیلنی چاہئے۔معاشروں میں تبدیلیاں اسی طرح وقوع پذیر ہوسکتی ہیں۔یہ آپس میں تعلقات رکھنے والے لوگوں سے شروع ہوتی ہے جو آپس میں مل جل کر کام کرتے ہیں اور یوں تبدیلی سارے سماج میں پھیل جاتی ہے۔دوسروں لفظوں میں اس کو اجتماعی افادیت کا نام بھی دیا جاسکتا ہے۔
رابرٹ سیمپسن کہتے ہیں کہ:

’ایسے معاشرے جن میں باہمی تفریق کم ہوتی ہے اوران میں باہمی افادیت کیلئے مل کر کام کرنے کا رجحان زیادہ ہوتا ہے، وہاں جرائم کی شرح کم ہوتی ہے۔ایسا صرف ابھی ہی نہیں بلکہ قدیم زمانے سے ہوتا آیا ہے۔باہمی افادیت کیلئے کام کرنے کا رجحان عموماً دیرپا ہوتا ہے۔اسی کی بنیاد پر پیش آنے والے جرائم کی شرح میں تبدیلیوں کی پیش گوئی کی جاسکتی ہے۔اس کی مدد سے لوگوں میں انفرادی اور اجتماعی طور پر پائے جانے والے منفی پہلوؤں کی نشاندہی بھی کی جاسکتی ہے۔ سب سے بڑھ کر باہمی تعاون سے کام کرنے معاشروں میں کئی دیگر مسائل کی شرح بھی کم ہوتی ہے۔ایسے مسائل میں شرح پیدائش، کم عمری کا حمل، نومولود بچوں کی اموات اور دیگر صحت سے جڑی ہوئی مصیبتیں شامل ہیں۔اگر کسی معاشرے میں باہمی تعاون کا ماحول پیدا ہوجائے تو وہاں رہنے والے لوگ امیر ہوں یا غریب، کالے ہوں یا گورے، ان کی ترقی کی ضمانت دی جاسکتی ہے۔‘

جمہوری کام کرنا

اگر کسی معاشرے میں رہنے والے لوگوں کی ترقی کا انحصار ان کے آپس کے تعاون پر ہو تو، باہمی تعاون کی عدم موجودگی ان کیلئے ایک بڑا اور سنجیدہ مسئلہ ہوسکتا ہے۔یوں نہ صرف سماجی مسئلہ بن جاتا ہے بلکہ اس سے جمہوری نظام کو بھی خطرات لاحق ہوجاتے ہیں۔اس باب میں وہ کام بتایا گیا ہے جو سرانجام دے کر شہری اپنے ہاتھوں میں مزید طاقت جمع کرسکتے ہیں۔اسی باب میں کئی مواقعوں کی نشاندہی کی جائے گی جن کی وجہ سے لوگ خودمختاری حاصل کرسکتے ہیں۔

میرے خیال میں شہریوں کو طاقتور بنانے کے کام کو 'جمہوری رواج' کا نام دیا جانا چاہئے۔ میں نے رواج کا لفظ واضح فرق پیدا کرنے کیلئے استعمال کیا ہے۔ کیونکہ رواج عموماً تکنیکی طریقہ کار سے مختلف ہوتے ہیں اوران کی اپنے آپ میں ہی ایک اہمیت ہوتی ہے۔مثال کے طور پر کیل ٹھونکنے کے کئی طریقہ کار ہو سکتے ہیں مگر کیل ٹھونکنا بذات خود ایک طریقہ کار سے کچھ بڑھ کر ہے۔اسی طرح پیانو بجانے کی اہمیت خالی انگلیاں چلانے سے کہیں بڑھ کر ہے۔انہیں رواج یا رویے کا نام دیا جانا زیادہ مناسب ہے۔

افسوس کی بات ہے کہ جمہوری رواج یا رویے کو رجحان دینے کیلئے دستیاب وسائل عموماً نظر انداز کر دیئے جاتے ہیں۔ یہ صورتحال اس خدشے کو پروان چڑھاتی ہے کہ عام لوگ کچھ کرنے کی اہلیت یا وسائل ہی نہیں رکھتے۔ اجتماعی کوشش کی غیر موجودگی میں اسی طرح کے کئی خدشے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔

جب میں یہ کہتا ہوں کہ لوگوں کے پاس معاشرے میں تبدیلی لانے کے مواقع ان وسائل سے کہیں بڑھ کر ہوتے ہیں جن کے بارے میں وہ آگاہ ہیں، تو میرے کہنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ صرف آپس میں تعاون کرنے کی وجہ سے ہی لوگ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ حالانکہ کچھ لوگوں کو تو سب سے پہلے اپنے عزم میں ہی تبدیلی لانے کی ضرورت ہے۔ عام لوگوں کا باہمی تعاون اس صورت میں ناکامی کا سامنا کر سکتا ہے جب انہیں پیسے کیخلاف یا عالمی نظریات کے خلاف استعمال کیا جائے۔لیکن اس کے باوجود لوگ مواقعوں سے فائدہ اٹھا کر اور اپنے اندر موجود طاقت کو استعمال میں لاکر کئی ایک وسائل سے مستفید ہو سکتے ہیں۔

سگزویل: روایات پر عمل کرنا

میں نے پہلے بابوں میں ایسے کئی مواقعوں کا تذکرہ کیا ہے جن سے فائدہ اٹھا کر لوگ آپس میں تعاون کر سکتے ہیں۔انہی میں سے ایک کسی مسئلے کو نام دینا بھی تھا۔کسی مسئلے کو کیا نام دیا جاتا ہے اور یہ نام کون دیتا ہے؟ یہ غیر ضروری سوالات ہیں۔اہمیت کی حامل باتیں تو نام، اور نام دیئے جانے کا انداز ہی ہیں۔

ہمارے ادارے نے ان مواقعوں کی نشاندہی بہت زیادہ معاشروں کے مشاہدات کے بعد کی ہے۔اگر ان کیسز کو انفرادی حیثیت میں دیکھا جائے تو شاید ان کا کوئی مناسب مطلب بھی نہ بن سکے۔لہذا میں نے یہ بتانے کیلئے کہ ہمارے ادارے نے اس عمل سے کیا سیکھا ہے، ایک مثال کا سہارا لیا ہے۔ میں نے کچھ حقیقت کچھ افسانے کی مدد سے ایک فرضی قصبہ تشکیل دیا ہے جس کا نام 'سگزویل' ہے۔سمجھانے کی غرض سے اس قصبے کے استعمال کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے کہ کیٹرنگ فاؤنڈیشن نے بہترین معاشروں کو بطور نمونہ استعمال کیا ہے بلکہ اس کا مقصد ایسے معاشروں سے تشبیہ دینا ہے جہاں مسائل کے حل کیلئے موجود مواقعوں کے باوجود لوگوں کو ان کے حل کیلئے کئی مصیبتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔میرا مقصد انہی مصیبتوں پر زور دینا ہے۔

مسائل کو ایسے نام دینا جو ان کی عزیز ترین اشیاء کی ترجمانی کریں

سگز ویل ایک غریب اور پسماندہ علاقہ تھا اور آج بھی دیہاتی صورتحال میں موجود ہے۔ ترقی کی راہ پر گامزن معاشرے کی تنزلی کا آغاز 1970 کی دہائی میں ہوا جب وہاں کی زرعی معیشت مسائل سے دوچار ہوئی۔ اس کے بعد 1990 کی دہائی تک وہاں بے روزگاری کی شرح 40% تک پہنچ چکی تھی۔ پراپرٹی کی قیمتیں گر چکی تھیں، یوں خالی پڑے کھیتوں سے منشیات کی صنعت نے جنم لیا۔ اسی علاقے میں بچوں کی بڑی تعداد غیر شادی شدہ نوعمر لڑکیوں کے ہاں پیدا ہونے لگی۔ سکولوں میں بچوں کے نتائج برے سامنے آنے لگے اور بڑی تعداد میں بچوں نے سکول جانا ہی چھوڑ دیا۔ اسی طرح کئی ایک بیماریوں کی شرح بھی دوسرے معاشروں سے کہیں زیادہ ہونے لگی۔ ان بیماریوں میں موٹاپا اور شراب نوشی سرفہرست تھیں۔ جو کوئی بھی وہ علاقہ چھوڑ سکتا تھا اس نے چھوڑ دیا۔ علاقہ چھوڑنے والوں میں بڑی تعداد کالج تک کی پڑھائی مکمل کرنے والے نوجوان تھے۔ اس صورتحال کو مزید خراب کرنے کیلئے معاشرے میں شامل لوگوں کے مابین کالے گورے اور امیر وغریب کی تقسیم بھی پیدا ہوگئی۔

اس صورتحال میں مقامی گرجا گھر اور باقی بچ جانے والی ایک دکان میں اس علاقے کے لوگوں نے اس بات پر بحث شروع کی کہ آخر ان کے دوستوں اور ہمسائیوں کے ساتھ کیا ہو رہا تھا؟ یوں لوگوں کی ایک چھوٹے سے گروہ نے آپس میں بات چیت کی اور علاقے کے مسائل پر تبادلہ خیال کیا۔ اس دوران نہ تو ابھی تک کوئی فیصلہ کیا گیا اور نہ ہی مسائل کے حل کیلئے کوئی کوشش کی گئی۔ اس کے بعد ایک قریبی یونیورسٹی کے لوگوں نے انہیں علاقہ بھر کے عوام کا اجتماع بلانے کا مشورہ دیا جس میں لوگ اپنے مسائل پر بات چیت کریں اور ان کے حل کے بارے میں سوچ بچار کریں۔ ابتداء میں اس اجتماع میں چند ہی لوگ شامل ہوئے۔ لوگوں معاشرے میں پیدا شدہ گروہوں کی صورت میں اجتماع میں شریک ہوئے۔ پھر کسی نے ان کی کرسیوں کو آپس میں جوڑ کر دائرہ بنا دیا اور یوں وہ آپس میں گھل مل گئے۔ اس کے بعد سب لوگوں نے اس صورتحال کا الزام کسی دوسرے پر لگانا چاہا مگر آخر میں ان کا کچھ ایسے مسائل پر اتفاق ہو گیا جن سے سب سے لوگ پریشان تھے۔ معاشی سکیورٹی سب سے بڑا مسئلہ تھا مگر یہ واحد مسئلہ نہ تھا۔ جرائم دوسرا بڑا مسئلہ تھے۔

یوں جیسے جیسے اس علاقے کے لوگوں کے اجتماعات ہوتے رہے، اسی طرح انہوں نے اپنی اپنی عزیز چیزوں کی فہرست تیار کی۔ لوگ نے کسی ایک ہی مسئلہ کا انتخاب کر کے باقی تمام ایشوز کو نظر انداز نہیں کر دیا لیکن معاشی صورتحال کی بحالی قصبے کے لوگوں کے سب سے بڑے مسئلے کے طور پر سامنے آئی۔ اور اس مسئلے کے ساتھ کئی اور مسائل جیسا کہ خاندانی عدم استحکام بھی جڑے ہوئے تھے۔ معاشرہ تباہ حالی کا شکار تھا اور اخلاقیات کا برا حال تھا جس کی وجہ سے لوگ خود کو غیر محفوظ محسوس کرتے تھے۔

لوگوں نے جوں جوں مسائل کی نشاندہی کی وہ ان کے حل کی طرف راغب ہونے لگے۔ وہ شراب نوشی

کا علاج کر سکتے تھے جو ان کے معاشرے میں خاندانی تباہی کا باعث بن رہی تھی۔ جب بڑوں نے تھوڑی سی ذمہ داری لینے کا ارادہ کیا تو وہ بچوں کے بھی بہت سے مسائل حل کرنے کے قابل ہو گئے۔ یوں مسائل کو نام دینا بھی ایک طرح سے ردعمل کے اظہار کا ذریعہ بن گیا۔

اگر سکزویل کی کہانی کسی ویڈیو میں دکھائی جا رہی ہوتو میں اس مقام پر ویڈیو کو روک دوں۔ مقامی لوگوں کا اجتماع اور ان کی آپس کی بات چیت ہی وہ جگہ تھی جہاں لوگوں کو اپنے مسائل حل کرنے اور اپنا مستقبل بہتر کرنے میں کردار ادا کرنے کا موقع میسر آیا۔ ان کے مسائل کو ایسے نام دیئے گئے جو ان چیزوں سے جڑے ہوئے تھے جن کو وہ بہت عزیز خیال کرتے تھے۔

لوگوں کو عزیز چیزوں کی نشاندہی کرنا مشکل کام نہیں تھا۔ ان سے پوچھا گیا کہ کوئی مسئلہ ان کو کس طرح متاثر کر رہا تھا؟ ان کا خاندان کس طرح مصیبتوں سے دوچار اور ان کی کونسی چیز خطرے کی زد میں ہے؟ ان سوالوں کے جوابات میں عوام کی پیاری چیزوں کو نوٹ کیا جا سکتا ہے۔ مسائل کو لوگوں کی عزیز ترین چیزوں سے منسوب کرنے کیلئے ضروری ہے کہ مسائل کو صرف عام الفاظ میں ہی بیان ہی کیا جائے۔ جب لوگ بتاتے ہیں کہ ان کی کونسی چیز خطرے میں ہے تو عام طور پر وہی چیز بتا رہے ہیں جو ان کو عزیز ہوتی ہے۔ اس طرح کی مختلف مثالیں جیسا کہ محفوظ محسوس کرنا، آزادی سے اپنے مفادات کے حصول کیلئے کوشش کرنا اور دوسروں کی طرف سے انصاف ملنا؛ پہلے ہی بیان کی جا چکی ہیں۔

مسائل کو ہمیشہ لوگوں کی عزیز چیزوں کے مطابق نام نہیں دیئے جاتے بلکہ بعض اوقات ان کو ماہرین کی طرف سے تکنیکی نام بھی دیئے جاتے ہیں۔ اس ضمن میں سرکاری ادارے اور میڈیا بھی اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ نام استعمال کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں مگر یہ صرف تکنیکی لحاظ سے ہی ٹھیک ہوتے ہیں۔ ان کی ایک خرابی یہ بھی ہے کہ یہ نام عام طور پر لوگوں کی غیر مادی چیزوں کی ترجمانی نہیں کرتے۔ لوگ عام طور پر غربت کو بھوک یا افلاس کے نام سے سننا چاہتے ہیں کیونکہ یہ ایک کیفیت کو بیان کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات لوگ اپنے مسائل کو دیئے جانے والے ناموں اور اپنے مسائل میں کوئی تعلق محسوس نہیں کرتے۔ سرکاری افسران اسی چیز کو اکثر اوقات عام لوگوں کی لاتعلقی قرار دیتے ہیں۔

ماہرین کی طرف سے دیئے جانے والے نام جب سکول میں اساتذہ کی طرف سے استعمال کئے جاتے ہیں تو کسی حد تک یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ عوام ان کے حل کیلئے کچھ کردار ادا کر سکتے ہیں۔ مگر بعد ازاں جب لوگوں کو احساس ہوتا ہے کہ وہ کچھ نہیں کر سکتے یا انہیں سمجھ نہیں آتی کہ وہ کیا کردار ادا کر سکتے ہیں تو وہ اس چیز کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور کسی معاشی مسئلے کو ایسا نام دیا جاتا ہے جو عوام سے بظاہر کوئی تعلق نہیں رکھتا تو اس پر بحث کیلئے عوام کو مدعو کیا جانا بے معنی دکھائی دیتا ہے۔ لوگ خیال کرتے ہیں کہ وہ اس بارے میں جانتے ہی نہیں تو وہ اس

دعوت نامے پر شریک کیسے ہو سکتے ہیں۔

ایسے ادارے جو لوگوں کو نظام کا حصہ بنانے کیلئے کوشاں ہیں انہیں یہ سوچنا چاہئے کہ مسائل کو ایسا نام دیا جائے جو عوام استعمال کرتے ہیں، لوگوں کی شمولیت میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔ کیونکہ ایسے نام مسائل کے ساتھ جڑے ہوئے لوگوں کے شدید تحفظات کا اظہار کرتے ہیں۔ یوں عوام کو اپنے مسائل کی ملکیت لینے کی حوصلہ افزائی ملتی ہے۔ مسائل کی ملکیت قبول کرنا ان کے حل کیلئے درکار سماجی انرجی کی موجودگی کی نشاندہی کرتا ہے۔

مسائل کو پیش کرنے کا ایسا انداز جس سے ان کے حل کی موجودگی کا تاثر ملے

معیشت سے متعلق مسائل کو حل کرنے کیلئے سگز ویل کے باشندوں نے یہ تجویز منظور کی کہ اس علاقے میں ایک کارساز فیکٹری شروع کی جائے گی۔ اگرچہ کچھ لوگوں کو اس مجوزہ حل پر کئی عملی اعتراضات تھے، یہ تجویز شامل کر لی گئی۔ کیونکہ اردگرد کے تمام ہی قصبوں میں انڈسٹری لگائی جارہی تھی۔ کچھ لوگ جنہیں اس تجویز پر اعتراض تھا اس اجتماع سے اٹھ کر چلے گئے اور امداد کے سلسلے میں حکومتی دفتر پہنچے جہاں ان کو اپنا کاروبار شروع کرنے کا مشورہ دیا گیا۔ دوسری جانب لوگوں کی اکثریت نے مقامی کاروبار کی ترویج پر بحث جاری رکھی۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ حال ہی میں شروع ہونے والا ریستوران اس علاقے میں صورتحال کو بہتر کرے گا۔ مگر یہ خیال درست ثابت نہیں ہو رہا تھا کیونکہ بے روزگار لوگ اس ہوٹل کے سامنے گھوم گھوم کر ہوٹل پر آنے والے گاہکوں کو شرمندہ کر رہے تھے۔

اس صورتحال میں مقامی لوگوں نے ایک ایسے فریم ورک کی ضرورت محسوس کی جس کے تحت ان کی طرف سے کئے جانے والے فیصلوں کو حقیقت میں تبدیل کیا جا سکے۔ بالکل اسی طرح جیسے پہلے کہا جا چکا ہے کہ عوامی مدد سے سماجی مسائل کو حل کرنے کیلئے ایسے کسی نظام یا انداز کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ ایک ایسا انداز جس میں دستیاب تمام مواقعوں کو شامل کیا جائے۔ یہاں یہ خیال رکھا جانا چاہئے کہ آپشنز یا مواقع لوگوں کی قیمتی چیزوں کو مدنظر رکھ کر ترتیب دیئے جانے چاہئیں۔ ساتھ ہی ساتھ اس موقع پر ان آپشنز کے مابین موجود چپقلش کو بھی بیان کیا جانا چاہئے۔ اختلافات سے نمٹنے کیلئے اس چپقلش کو سمجھنا انتہائی ضروری امر ہے۔

اگر اختلافات سے نمٹنے کو بہترین حل ایسا طریقہ کار ہونا ہی ہے تو ایسے مسائل سے روزمرہ زندگی میں کیسے نمٹا جائے؟ اس عمل کا آغاز اس عام سے دوال سے کیا جا سکتا ہے 'اگر آپ کو اس قدر ہی فکر ہے تو آپ ہی بتائیں کہ اس مسئلے کے حل کیلئے کیا کیا جانا چاہئے؟' بالکل اسی طرح جیسے سگز ویل کے لوگ مسائل کا ردعمل الفاظ اور عمل دونوں کی صورت میں دیتے تھے۔ بیان کئے جانے والے تحفظات میں ہی مسائل کا مجوزہ حل بھی پنہاں ہوتا ہے۔

یوں لوگوں کے تحفظات ہی کئی حل بھی تجویز کئے دیتے ہیں۔شاید یہی صورتحال سگز ویل میں بھی سامنے آئی جب وہاں کے لوگوں نے معیشت کے مسئلے کو حل کرنے کیلئے بات چیت کی۔لوگوں نے مویشت کی بحالی کیلئے متعدد تجاویز پیش کیں۔ابتداء میں اس کی وجہ نوکریوں کی عدم دستیابی بتائی گئی مگر جیسے جیسے دیگر وجوہات سامنے آتی گئیں یہ وجہ کچھ غیر مناسب سی لگنے لگی۔

اگرچہ مسئلہ حل کرنے کیلئے مختلف طریقہ کار سامنے آتے ہیں مگر اکثر اوقات وہ کسی ایک ہی خاص چیز کے گرد گھوم رہے ہوتے ہیں۔اس مسئلے میں یہ چیز معیشت تھی، پیش کئے جانے والے تمام حل اسی مسئلے سے متعلق تھے۔یوں ایک آپشن میں کئی ایک ایسے طریقہ کار شامل ہوتے ہیں جو ہمیں کسی ایک خاص سمت میں لیجانے کی ہی کوشش کرتے ہیں۔

علاقے میں کارساز کمپنی کا قیام، اپنے کاروبار کی ترویج اور مقامی کاروبار کی حوصلہ افزائی وہ سب طریقہ کار تھے جن کا مقصد نئی نوکریاں پیدا کر کے معیشت کی بحالی ہی تھا۔اسی طرح مقامی لوگوں کے اجتماع جو دوسرے آپشنز پیش کئے گئے وہ علاقے کو رہنے کے قابل بنانے سے متعلق تھے۔جیسا کہ سکولوں کو بہتر کرنا، نوجوانوں کیلئے مزید سرگرمیوں کا آغاز کرنا اور جرائم کی کمی کرنا۔معاشی ترقی کو صرف نوکریوں تک ہی محدود نہیں کر دیا گیا تھا بلکہ اس کا دائرہ کار انتہائی وسیع کر دیا گیا تھا۔

ایک ایسا طریقہ کار جو مسائل کی نشاندہی کرتا ہے اور ان کے حل کیلئے مختلف مواقع بیان کرتا ہے، انصاف پر مبنی ماحول فراہم کرتا ہے جہاں تمام آپشنز کو بہترین انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔وہاں تمام مواقعوں کے فوائد اور نقصانات کو تعصب سے بالاتر ہو کر بیان کیا جاتا ہے۔

عوامی بحث میں ایسا ماحول عام طور اختلاف رائے کو جنم دیتا ہے نہ کہ یکسوئی کو۔یوں مختلف آپشنز پر بات چیت کے دوران ایک دوسری کو مختلف سمتوں میں جاتا ہوا تصور کرتے ہیں۔یوں اس جذبے کو کئی کوششوں کے باوجود بھی ختم نہیں کیا جا سکتا۔اس کے برعکس اگر مباحثے کے آغاز پر ہی ان چیزوں کی نشاندہی کر دی جائے کہ لوگوں کیلئے کونسی چیزیں اہم ہیں تو شاید لوگوں کو احساس ہو کہ مختلف آراء رکھنے کے باوجود بھی شاید وہ ایک ہی بات کہہ رہے ہیں۔اس بات کے احساس کے ساتھ ہی باہمی اختلاف کی فضاء ختم ہو سکتی ہے۔

'اختلاف رائے جمہوریت کا مسئلہ نہیں ہے، یہ تو دراصل انسانی فطرت کا حصہ ہے اور اس کو حل بھی نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ایک خاص حد تک اختلاف تو انتہائی ضروری ہوتا ہے۔الگ الگ خیالات رکھنے کی وجہ سے ہم ایک ہی جیسی سوچ رکھنے کی وجہ سے ہونے والے نقصانات سے بچ جاتے ہیں۔اصل مسئلہ یہ ہے اختلاف رائے سے نمٹا کیسے جائے؟ کونسی چیز

درست ہے؟عام طور پر اس سوال کا جواب نہیں مل پاتا اور نہ ہی اس پر کوئی کام کیا جاتا ہے۔دراصل یہ چیز ہے جو جمہوریت کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرتی ہے۔'

جب ہم ذاتی طور پر محسوس کرتے ہیں کہ ہم مختلف سمتوں میں جا رہے ہیں تو ہم اپنی سوچ کو کچھ دیر کیلئے ترک کر کے دوسروں کے بات کو مزید غور سے سنتے ہیں۔چاہے دوسروں کی آراء سے ہمیں سخت ترین اختلاف ہی کیوں نہ ہو۔اس طرح کی سوچ ہمیں مسائل کو ایک نئے نقطہ نظر سے دیکھنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔یعنی ہمیں پورا منظر دیکھنے کو ملتا ہے۔مسائل کے موثر حل کیلئے یہ صلاحیت حاصل کرنا انتہائی ضروری ہوتا ہے۔مسائل کو نئے سرے سے دیکھنا ہمیں ان کے حل کے نئے مواقع بھی فراہم کرتا ہے۔

بہتر فیصلہ سازی کیلئے عوامی مباحثہ کرنا

سگز ویل گاؤں کے اگلے اجتماع میں شامل ہونے والے لوگوں کی تعداد زیادہ تھی۔مقامی انتظامی کونسل کے کچھ رکن بھی مباحثے میں شریک ہونے لگ گئے تھے۔لوگ جانتے تھے کہ پوری کمیونٹی کا وجود خطرے میں تھا۔انہوں نے ریستوران کو بچانے کی سوچ بچار سے بحث کا آغاز کیا۔ابتداء میں ہوٹل کو پیش آنے والی مصیبتوں کے ذامہ داران سے متعلق بات کی گئی۔پولیس چیف کا کہنا تھا کہ صورتحال سنجیدہ کاروائی کا مطالبہ کرتی ہے۔لوگوں کا خیال اس سے کچھ مختلف تھا۔ان کے مطابق اگر اس طرح علاقے کے گلی محلے صاف کر بھی دیئے گئے تو پوری کمیونٹی پولیس سٹیٹ کی شکل اختیار کر جائے گی۔ان کا سوال تھا کیا عام لوگ اس صورتحال کا سامنا کر پائیں گے؟

جب لوگ اس بحث میں مصروف تھے تو وہاں موجود ایک عورت نے بتایا کہ گلیوں میں اس طرح کی حرکات شراب نوشی کی علامت ہیں۔یوں بات چیت کا رخ متعین ہو گیا اور لوگ اس بات پر بحث کرنے لگے کہ ان کی کمیونٹی کی فلاح کیلئے کیا زیادہ اہم تھا؟ لوگوں کیلئے عزیز چیزوں کی تعداد کافی زیادہ تھی۔ان کا اتفاق تھا کہ انہیں ایک ایسا معاشرہ تشکیل دینا ہے جہاں خاندان اور بچے محفوظ رہ سکیں۔ جہاں اچھے سکول ہوں اور مضبوط معیشت ہو۔

مگر اس کیلئے اٹھائے جانے والے مجوزہ اقدامات اٹھانے کے نتائج اتنے ہی برے ہو سکتے تھے جتنے قانون نافذ کرنے والے اداروں کی سخت کاروائی کے۔باہمی چپقلش سے بچا نہیں جا سکتا تھا۔لوگوں کو فیصلہ کرنا تھا کہ انہیں کمیونٹی کیلئے کونسی چیز زیادہ عزیز تھی۔یوں وہ دستیاب مواقعوں کے ممکنہ نتائج کا جائزہ لینے کیلئے تیار ہو چکے تھے۔

اب ذرا سگز ویل کے ماحول سے باہر نکلیں اور کسی ایسے موقعے کے بارے میں سوچیں جہاں آپس میں کسی مقامی مسئلے کے حل کی تلاش میں کوئی عوامی مباحثہ منعقد کروانے جا رہے ہوں۔ایسی بحث جہاں تمام آپشنز پر

کھل کر بات ہو اور موجود لوگوں میں سے کوئی یہ سوال پوچھنے کی بھی جسارت کرے کہ 'اگر ہماری جانب سے پیش کئے جانے والے حل پر عمل درآمد کی صورت میں بھی ہمیں فلاں فلاں نقصانات ہوں گے، تو کیا اس سب کے باوجود آپ اسی حل کی حمایت کریں گے؟'

عوامی مباحثہ کئی مراحل پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس دوران سب کچھ ایک ہی دفعہ نہیں ہو جاتا بلکہ فیصلہ سازی کیلئے ایک لمبا وقت درکار ہوتا ہے۔ اس کیلئے مقامی لوگوں کا ایک اجتماع کافی نہیں ہوتا۔ اور پھر یہ مراحل کسی خاص ترتیب میں وقوع پذیر نہیں ہو رہے ہوتے بلکہ یہ تو ایک سدا بہار جاری عمل کا حصہ ہوتے ہیں۔ کچھ معاشروں میں ابتدائی طور پر لوگ یہ سوچ سکتے ہیں کہ ایسا کوئی مسئلہ موجود ہی نہیں جس سے انہیں کوئی سروکار ہو۔ یوں پہلے مرحلے میں لوگوں کو یہ سوچنا ہے کہ کہیں ان کی کوئی عزیز ترین چیز تو خطرے میں نہیں ہے؟ یوں شاید انہیں اس مسئلے کا احساس ہو جائے جس کو وہ پہلے نظر انداز کر رہے تھے۔ اس کے بعد کسی ایسے شخص کی تلاش کی جاتی ہے جس پر اس مسئلے کا ملبہ گرایا جا سکے۔ اس مرحلے پر ابھی لوگ اس بات کی آگہی نہیں رکھتے ہوتے کہ انہیں بھی کچھ کردار ادا کر کے مسئلہ نمٹا دینا چاہئے۔ مختلف آپشنز پر غور شروع ہوتا ہے تو لوگوں کے مفادات کے مابین موجود چپقلش زیر بحث آتی ہے۔ اس کے بعد مجوزہ آپشنز کے فوائد و نقصانات پر غور کا مرحلہ آتا ہے۔ اس کے بعد ہی کہیں جا کر لوگ عملی طور کچھ کرنے پر تیار ہوں اور یوں وہ کسی ایک سمت میں سفر کرنے لگیں۔

'ان تمام مراحل سے گزرتے ہوئے ڈین ینکلووچ نے محسوس کیا کہ ایک جمہوری نظام کا شہری ہونا تو دراصل ہر وقت سیکھتے رہنے کے عمل کا حصہ ہے۔ لوگ براہ راست نئی معلومات نہیں حاصل کر لیتے اور نہ ہی وہ نئے اٹھنے والے مسئلے کے حل پر تیار ہو جاتے ہیں۔ اس سب کیلئے وہ ایک خاص عمل سے گزرتے ہیں جو قدرے بے ترتیب ہوتا ہے۔ یہاں نتیجہ اخذ کرنے کی بات یہ ہے کہ لوگ دیر سے صحیح مگر سیکھ ضرور لیتے ہیں۔ اس کو وقت لینے والا کام تو قرار دیا جا سکتا ہے مگر ناممکن کام نہیں۔'

ان مراحل کی وجہ سے سرکاری افسران اور مقامی انتظامیہ پر بھی کئی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اگر لوگوں کی سوچ سے متعلق کوئی اندازہ لگانے کی کوشش کی جائے تو یہ ایک مشکل امر ہے۔ اگر ماہرین کو عام لوگوں کے ساتھ مل کر کام کرنا ہے تو انہیں بھی وہیں سے شروع ہونا چاہئے جہاں سے عام لوگ شروع ہوتے ہیں۔ یہ عام طور پر وہ مقام ہوتا ہے جہاں ابھی لوگوں کو تو مسئلے کی موجودگی کا احساس بھی نہیں ہوتا مگر ماہرین کی سوچ کہیں آگے تک جا چکی ہوتی ہے۔ اس مقام پر عام لوگ تو شاید ابھی مسئلے کو حل کرنے پر تیار بھی نہ ہوں۔ مگر اصل میں تو مسئلے کی

نوعیت سمجھنے کی ہی ضرورت ہوتی ہے کہ دراصل مسئلہ ہے کیا؟

مزید یہ کہ اگر لوگوں کو احساس ہو بھی جائے کہ یہاں کوئی سنجیدہ مسئلہ درپیش ہے تو اس کے باوجود وہ اس کو حل کرنے سے کتراتے ہیں، یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ اس صورتحال کیلئے کوئی قربانی کا بکرا ڈھونڈ رہے ہوں۔ ان معاملات کو فطری طریقے سے لے کر چلنے کی وجہ سے معاملے سے نمٹنے میں سرکاری افسران کو آسانی میسر آ سکتی ہے۔ یہاں تک کہ جب لوگ مسئلے کی ذمہ داری کسی دوسرے پر ڈال رہے ہوتے ہیں تو اس وقت بھی انہیں معلوم نہیں ہوتے کہ ان کے پاس اس کے حل کیلئے کیا آپشنز دستیاب ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں پر لوگ مختلف سمتوں میں جا سکتے ہیں۔ خاص طور اس صورت میں جب سیاستدان معاملات کو روایتی طریقے سے نمٹانے کی کوشش کریں۔ تاہم جب ایک دفعہ لوگ اس معاملے سے جڑے تحفظات تک پہنچ جاتے ہیں تو پھر وہ اسی معلومات پر زیادہ بھروسہ کرتے ہیں جس کے نتیجے میں ان کے تحفظات دور ہو رہے ہوتے ہیں۔

اس کے بعد جب لوگ اپنے لئے کسی خاص سمت کا انتخاب کر لیتے ہیں تو عام لوگ تو اپنے لئے کوئی خاص ہدایت نامہ جاری نہیں کرتے جس کی روشنی میں انہیں کام کرنا ہوتا ہے۔ مگر دوسری طرف افسران کے پاس اس طرح کا مواد بخوبی موجود ہوتا ہے۔ یوں ان افسران کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ آخر وہ کون کون سی چیزیں ہوں گی جن کو عوام کی حمایت حاصل نہیں ہو سکے گی۔ کئی حالات میں تو ان افسران کو محسوس ہوگا کہ مسئلے کا حل سیاسی طور پر جائز چیزوں سے کہیں باہر ہی موجود ہے۔ یہ وہ مقام ہوتا ہے جہاں عوامی مباحثہ مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ عوام ان افسران کو بتا سکتے ہیں کہ کیا وجہ تھی جس کے سبب وہ یہ کام کرنے پر تیار ہوئے تھے یوں وہ اس کڑے وقت میں ان کی رہنمائی کر سکتے ہیں۔

وسائل کی نشاندہی کرنا

جب سگز ویل کے لوگ یہ سب سوچ بچار کرنے میں مصروف تھے تو دوسری جانب کچھ گروہ یہ کام پہلے ہی سرانجام دے رہے تھے یا ان سے متعلق منصوبہ سازی کر رہے تھے۔ یعنی منصوبہ سازی اور اس پر عمل درآمد کا عمل ساتھ ساتھ ہی چل رہا تھا۔ عوام کو یہ پریشانی لاحق تھی کہ نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد بغیر کسی رہنمائی کے ہی زندگی گزار رہی تھی۔ اس صورتحال میں کئی سماجی تنظیمیں کچھ حل سامنے لے کر آئیں جیسا کہ بیس بال کے مقابلے منعقد کرانا، سکول کے بعد خصوصی تربیتی کلاسز اور نوجوانوں کی خدمات کو گرجا گھروں تک بڑھانا۔ شراب نوشی معاشرے میں کئی خرابیوں کا باعث بن رہی تھی اس وجہ سے اجتماع میں موجود کچھ لوگوں نے شراب نہ پینے والوں کے اجتماع کی بات کی۔ یوں ان کے اجتماع کیلئے درکار جگہ کا مسئلہ پیدا ہوا جس کیلئے کسی نے ایک خالی عمارت میسر کر دی۔ یوں ایک ہی اجتماع میں موجود مختلف مسائل کے حل کیلئے کام کر رہے تھے۔ لیکن ان کی سمت ایک ہی تھی۔ ایک ایسی سمت جو سب لوگوں نے آپس میں مل کر متعین کی تھی۔ یہ سمت عوامی مباحثوں کے دوران ہی پیدا ہوئی تھی۔

کیونکہ فیصلوں پر از خود عمل ممکن نہیں تھا اس لئے اس علاقے کے لوگ وسائل کی نشاندہی کرتے گئے اور ان وسائل کی فراہمی کے وعدے بھی کرتے گئے۔ کیونکہ لوگ اپنے معاشی مسائل کو اہمیت دیتے تھے اس وجہ سے کئی نظر انداز کئے جانے والے وسائل کی بھی نشاندہی ہوتی گئی۔ ایسی چیزیں جنہیں پہلے ناقدری کی نظر سے دیکھا جاتا تھا انہیں ایک نئی نظر سے دیکھا جانے لگا۔ کچھ ایسا ہی ان لوگوں اور اداروں کے بارے میں سمجھا جانے لگا جو ان وسائل کے مالک تھے۔ سگز ویل کے رہائشیوں کیلئے بیس بال کے کوچز کی کوئی اہمیت نہ تھی مگر یہ وہ وقت تھا جب انہیں بھی مطلوبہ اہمیت ملنے لگی۔

مسائل کو حل کرنے کیلئے درکار وسائل بعض اوقات ایسی جگہوں سے بھی میسر آتے جہاں سے ایسی کوئی توقع نہیں کی جاسکتی۔ سگز ویل کے ایک انتہائی پسماندہ علاقے میں لوگوں نے اس بارے میں سوچنا شروع کیا کہ ان کے بچے آخر کیا سیکھ رہے تھے۔ اس پر مقامی گرجا گھر کی انتظامیہ نے ان سے رابطہ کیا۔ انہوں نے بچوں اور کم پڑھے لکھے لوگوں میں کو پڑھانے کے بارے میں وسائل کی جانچ پڑتال شروع کی۔ یہ وسائل انہیں چند سوالات کے جوابات کے طور پر میسر آئے۔ آپ نے تعلیم کہاں سے حاصل کی؟ کونسے عوامل تھے جن کی وجہ سے ان کو تعلیم کے حصول میں مدد ملی؟ اور آپ کونسا کام اچھا کر لیتے ہیں؟ ابتداء میں لوگوں نے انہیں یہی جواب دیا کہ انہوں نے کبھی کسی کو پڑھایا ہی نہیں ہے۔ شاید یہ جواب اس وجہ سے سامنے آیا کہ ان کی مراد کلاس رومز میں پڑھانے سے تھی۔ تاہم بعد ازاں عوام نے ایسے کئی طریقے بتائے جن سے انہوں نے دوسروں کو کچھ سکھایا تھا۔ انہوں نے لوگوں کو بنیادی کام جیسا کہ کپڑے سینا، کھانا پکانا اور سامان کو محفوظ کرنا سکھا رکھا تھا۔ ان کے دیئے گئے اسباق میں عزم، ہمت اور حوصلہ بھی شامل تھے۔ ایسے وسائل انتہائی اہمیت کے حامل تھے۔ ان کی مدد سے مسائل سے نمٹا جا سکتا تھا۔ جب لوگوں کو یہ احساس ہوتا ہے کہ ان کے پاس مطلوبہ وسائل موجود ہیں تو ان کو وہ طاقت بھی میسر آجاتی ہے جس سے معاشرے میں تبدیلی متعارف کروائی جاسکتی ہے۔

لوگوں کو کچھ کر گزرنے پر آمادہ کرنے کیلئے ضروری ہے کہ انہیں عوامی مباحثے کی ابتداء میں یہ بتایا جائے کہ ان کے پاس مطلوبہ وسائل پہلے ہی سے موجود ہیں۔ انہیں اس عمل میں شامل ہونے والے لوگوں مثلاً اداروں، سکولوں، ہسپتالوں، غیر سرکاری سماجی تنظیموں اور دیگر، کے بارے میں آگاہ کیا جانا چاہئے۔ یہ ادارے بذات خود تو کسی معاشرے کے مسائل کو حل نہیں کر سکتے۔ مگر ان کے ساتھ مقامی لوگوں کی کوشش شامل ہو جائے تو صورتحال مکمل طور پر بدل سکتی ہے۔ اس مقصد کیلئے انہیں معاشرے کے ہر حصے سے کچھ ردعمل درکار ہوتا ہے۔

افسوس کی بات ہے کہ معاشروں میں موجود اکثر مقامی وسائل کی نشاندہی نہیں کی جاتی۔ اداروں کے مابین موجود سیاست سب عوامل پر حاوی نظر آتی ہے۔ بعض اوقات لوگ مسائل اور ان کیلئے درکار وسائل کی نشاندہی کرتے ہیں مگر ماہرین اور سرکاری افسران کا معاملے میں دخل ان لوگوں کو معاملات سے نکال باہر کرتا ہے۔

ادارے عام طور پر روزمرہ ذرائع اور باقاعدہ منصوبہ بندی پر توجہ دیتے ہیں۔ایسی چیزوں میں سماجی کام کی گنجائش نہیں ہوتی۔افسران سمجھتے ہیں کہ لوگوں کا کام صرف مسائل سے متعلق بتانا ہی ہوتا ہے اور اس مرحلے کے بعد اگلا کام ماہرین کا ہوتا ہے جو اپنے وسائل استعمال میں لاتے ہیں۔

لوگوں کو مقامی سماجی منصوبوں میں شامل نہ کئے جانے کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ سرکاری افسران اور ادارے عوام کو نظام میں شامل کرنے کی بے سود کوششیں کر کے تھک چکے ہیں۔اس سب کا تذکرہ پہلے کیا جا چکا ہے۔اس کے علاوہ اداروں کے پاس مالی وسائل اور قانونی طاقت دستیاب ہوتی ہے۔جس کی وجہ سے وہ عام طور پر ٹھیکے دینے کو ہی ترجیح دیتے ہیں۔اس کے برعکس عوامی تنظیمیں لوگوں کو طاقت کے زور پر کام کرنے پر مجبور نہیں کر سکتیں اور نہ ان کے پاس ایسا کرنے کی کوئی قانونی وجہ ہوتی ہے۔

'میں جمہوریت میں یقین رکھتا ہوں کیونکہ اس نظام میں تمام شہریوں کی صلاحیتوں کو استعمال کیا جاتا ہے'۔۔۔وڈرو ولسن

کیا وجہ ہے کہ کوئی قانونی ذمہ داری یا مالی وسائل کی غیر موجودگی میں بھی لوگ قدرتی آفات کے بعد فوراً طبی امداد دینے کیلئے ٹیمیں تشکیل دیتے ہیں؟ ایسا کرنے سے نہ صرف ان کا وقت ضائع ہوتا ہے بلکہ یہ ان کیلئے خطرناک بھی ثابت ہوسکتا ہے۔پھر ایسا کیا ہے جو عوام ایسے کام کرنے کیلئے عزم کا اظہار کرتے ہیں؟ اس کے علاوہ دوسرے شہری بھی ان سے کچھ ایسے کی توقع رکھتے ہیں۔ایسی کوششوں میں مزید تیزی اس صورت میں ظاہر آتی ہے جب لوگ اپنے ذاتی وسائل استعمال کرنے کا بھی وعدہ کرڈالتے ہیں۔کچھ لینے کچھ دینے کا مظاہرہ کیا جاتا ہے اور یہ کام سرانجام دیئے جاتے ہیں۔ایسا ہی کچھ سگز ویل میں بھی ہوا ہوگا جہاں لوگوں نے عوامی مباحثے میں ایسے وسائل دستیاب کرنے کے وعدے اور یقین دہانیاں کروائیں۔

متبادل حکمت عملی تیار کرنا

جب لوگ مقامی کاروباری عمل کو بحال کرنے کیلئے کوشاں تھے تو کچھ لوگ اس بحث میں داخل ہوگئے کہ صرف اس طریقے سے لوگوں کی مطلوبہ تعداد کو روزگار میسر نہیں آسکے گا۔اس سے اتنی بڑی کامیابی حاصل نہیں ہو سکے گی کہ معیشت مکمل طور پر بحال ہو جائے۔ان کا خیال تھا کہ انہیں قریبی علاقے کے کاروباری لوگوں کو بھی اس علاقے میں اپنا پیسہ لگانے کی طرف راغب کرنا چاہئے۔اسی دوران کسی نے کہا کہ سگز ویل کے پارک کی حالت زار دیکھ کر تو کوئی بھی کاروباری شخص اس علاقے میں اپنا کاروبار پھیلانے پر تیار نہیں ہوگا۔وہ سمجھے گا کہ یہاں پیسہ لگانا تو سراسر پیسہ ضائع کرنا ہی ہے۔اگرچہ بہت کم لوگ پارک کی حالت اور کاروبار میں موجود تعلق کو سمجھتے تھے پھر

بھی کئی لوگوں نے اس بات سے اتفاق کیا۔لیکن اس علاقے میں صفائی کرنے والے عملے کے صرف تین اہلکار ہی رہتے تھے۔اس صورتحال میں لوگوں نے سوچا کہ کیا مقامی باشندے خود سے اس پارک کو صاف کرنے پر تیار ہو جائیں گے؟ ماضی میں ایسے کسی کام کیلئے عوامی ردعمل کوئی خاطرخواہ نہیں تھا۔لیکن اس دفعہ عوام کے ایک گروہ نے یہ ذمہ داری قبول کی کہ آنے والے ہفتے کے دن وہ لوگوں کو مطلوبہ سامان سمیت پارک کی صفائی کیلئے لے کر آئیں گے۔

ان سب اجتماعات کے دوران علاقے کا نومنتخب میئر زیادہ تر خاموشی سے بیٹھا ہوا تمام تر صورتحال کا جائزہ لیتا رہتا تھا۔اس فورم کا آغاز اس سے پہلے میئر کے دورحکومت کے دوران ہوا تھا اور وہ اس ضمن میں اپنی کوئی ذمہ داری نہیں سمجھتا تھا۔ بلکہ درحقیقت وہ اس فورم کے تحت ہوانے والی سرگرمیوں کی وجہ سے شکوک وشبہات میں مبتلا تھا۔اس کا خیال تھا کہ ایسے اجتماعات مستقبل میں ایک نئے پریشر گروپ کی شکل اختیار کر سکتے ہیں۔دوسری طرف کچھ لوگوں کا خیال تو تھا کہ انہیں مقامی حکومت سے مدد حاصل کرنی چاہئے مگر اس فورم نے نہ تو ایسا کوئی فیصلہ کیا اور نہ اس پر کوئی مباحثہ منعقد ہوا۔لوگوں کیلئے میئر کی طرف سے کوئی مدد نہ دیا جانا بھی ایک عجیب امر تھا۔حالانکہ وہ ساری صورتحال کا عینی شاہد تھا۔مگر اس اعلان کے بعد لوگ یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ میئر کی طرف سے پارک کی صفائی کیلئے کچھ لوگوں کو بھیج دیا گیا تھا۔انتظامیہ نے صفائی کیلئے بڑے بڑے ٹرک اور معیاری مشینری دستیاب کردی تھی۔

مواقع اور وسائل اس وقت دستیاب ہونا شروع ہوتے ہیں جب لوگ کسی متفقہ سمت میں چلنے کا فیصلہ کر لیتے ہیں۔ ایسا ہی کچھ سگز ویل میں بھی ہوا تھا۔ جہاں لوگوں کے پاس اپنی نوعیت کے وسائل موجود ہوتے ہیں وہیں لوگوں کا کام کرنے کا بھی اپنا ہی ایک اچھوتا طریقہ ہوتا ہے۔لوگ سماجی نوعیت کے منصوبوں میں خود رضا کارانہ طور پر شامل ہوتے ہیں اور اس کے برعکس حکومتیں اور سرکاری ادارے عوام کی جگہ کچھ کام سرانجام دے رہے ہوتے ہیں۔عوامی کاموں میں شامل ہونے والے اور نہ شامل ہونے والے لوگ برابر مستفید ہوتے ہیں۔ معاشرے کے مختلف حصوں کی طرف سے کچھ الگ الگ کام کئے جاتے ہیں مگر ان سب کا مقصد معاشرے میں بہتری لاناہی ہوتا ہے۔

عوام کی طرف سے شروع کئے جانے والے منصوبے بظاہر مختلف سمتوں میں جاتے ہوئے نظر آتے ہیں مگر ان کو بڑے پیمانے پر دیکھا جائے تو یہ سب ایک ہی عمل کا حصہ نظر آتے ہیں۔ایک ایسے سمت نظر آتی ہے جو عوامی مباحثوں کے نتیجے میں متعین کی گئی ہوتی ہے۔ان کاموں کی وجہ سے سامنے آنے والے نتائج نہ صرف مختلف ہوتے ہیں بلکہ وہ ایک دوسرے کیلئے مددگار بھی ہوتے ہیں۔ یوں ایک منصوبے کی کمی اور خرابیوں کو دوسرا منصوبہ پورا کرتا ہے۔ یوں یہ منصوبے آپس میں مل کر ہی ایک دوسرے کو مکمل کر سکتے ہیں۔ یہ تعاون باقاعدہ طور پر کام

کرنے والی تنظیموں کے کاموں سے مختلف ہوتے ہیں۔ ایسے ہی متبادل طریقہ کاروں سے لوگ اپنے آپ کو مکمل اور متوازن محسوس کرتے ہیں۔

انسان میں یہ صلاحیت موجود ہوتی ہے کہ خود کو سنبھال سکے۔ قدرتی آفات کے بعد پیدا ہونے والی صورتحال میں ایسا سب دیکھا بھی جا سکتا ہے۔ ایک دوسرے کی مدد کرنا اور آفات سے نمٹنے کیلئے ایک دوسرے سے تعاون کرنا شاید انسانی تاریخ میں بہت قدیم عمل ہے۔ یہ صدیوں سے ہوتا چلا آیا ہے۔ ایسے وقت سے بھی پہلے جب معاشروں میں سربراہی کا نظام متعارف ہوا۔ یہ سب اس وقت سے پہلے ہو رہا تھا جب یونانیوں نے لفظ جمہوریت کا پہلی بار استعمال کیا تھا۔

متبادل منصوبوں پر کام کرتے ہوئے آپس میں ایک قسم کے تعاون کی ضرورت ہوتی ہے مگر عوامی منصوبوں میں یہ تعاون قائم کرنے کیلئے کوئی انتظامیہ موجود ہوتی ہے اور نہ ہی اس کام پر پیسہ خرچا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سارے کام پر آنے والے مالی اخراجات سرکاری اداروں کے مقابلے میں انتہائی کم ہوتے ہیں۔

ایسے متبادل منصوبوں سے حاصل ہونے والے فوائد مالی ثمرات سے بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ ایک تحقیق میں یہ بات سامنے آئی کہ لوگوں کے آپس میں مل جل کر کام کرنے سے مالی فوائد تو حاصل ہوتے ہی ہیں کہ منصوبہ مکمل ہو جاتا ہے بلکہ سب سے بڑھ کر یہ فائدہ حاصل ہوتا ہے کہ اس سے لوگ یہ سیکھتے ہیں کہ باہمی طور پر تعاون کر کے معاشرے میں کوئی بڑی تبدیلی برپا کی جا سکتی ہے۔ لوگ جب آپس میں مل کر کام کرتے ہیں تو انہیں باہمی تعاون کی حقیقت پسندانہ اہمیت کا احساس ہو جاتا ہے کہ وہ آپس میں کیسے تعاون کر سکتے ہیں؟ یہ تعاون ایک سیاسی اعتماد کی صورت میں ہوتا ہے جس کی اہمیت ذاتی تعلقات اور ذاتی اعتماد سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ یہ تعاون ایسے لوگوں کے مابین قائم ہوتا ہے جو نہ تو دوست ہیں اور نہ رشتہ دار۔ لوگوں کیلئے صرف یہ احساس کرنا ہی ضروری ہوتا ہے کہ وہ آپس میں مل کر معاشرے میں موجود مسائل کو حل کر سکتے ہیں۔ اسی احساس کے ساتھ عملی رشتے پیدا ہوتے ہیں۔

شہری اصلاحات کے موضوع پر کی جانے والی ریسرچ میں حکومتی منصوبوں کے ساتھ ساتھ شروع کئے جانے والے عوامی سماجی متبادل منصوبوں کی اہمیت کا اندازہ تو کئی بار ہو چکا ہے۔ مثال کے طور پر کلیرنس سٹون نے اپنی تحقیق میں یہ بات نوٹ کی جن منصوبوں پر عوام اور ادارے مل کر کام کر رہے ہوتے وہ ان منصوبوں کی نسبت زیادہ کامیاب ہوتے ہیں جو صرف اداروں کی طرف سے مکمل کئے جاتے ہیں۔ اداروں کو لوگوں کو متبادل منصوبے شروع کرنے پر اکسانے میں کچھ مشکلات کا سامنا تو کرنا پڑ سکتا ہے مگر جب وہ ان کی اہمیت اور ضرورت کا احساس کر لیتے ہیں تو وہ سمجھنا شروع ہو جاتے ہیں کہ ادارے اور عوام ایک دوسرے کیلئے کتنے ضروری ہیں۔

بطور معاشرہ سیکھنا

اگر چہ سگز ویل میں نئی انڈسٹری تو شروع نہ ہوسکی مگر پہلے سے موجود ریستوران چلتا رہا۔ اسی طرح اس علاقے میں منشیات فروشی کا کاروبار بھی چلتا رہا مگر شہریوں کے آپس کے تعاون اور پولیس کے محکمے کے اقدامات کے سبب نشہ آور اشیاء کا سرعام کاروبار کسی حد تک کم ہو گیا۔ گلیوں میں ادھم مچانے والے لوگ اس حرکت سے باز آ گئے۔ اگر چہ علاقے میں شراب نوشی کی حالت پہلے جیسی ہی تھی مگر عوامی اجتماعات میں شامل ہونے والے افراد کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ دوسری جانب نوجوانوں کیلئے متبادل سرگرمیوں کی وجہ سے نوعمر لڑکیوں کے حاملہ ہونے اور بچوں کے سکول سے نکالے جانے کے واقعات بھی کم ہو گئے۔

اسی دوران سگز ویل میں سماجی صورتحال بہتر کرنے والی غیر منظم یہ تنظیم ایک باقاعدہ سماجی تنظیم بن گئی۔ توقع کے مطابق اس باقاعدہ تنظیم میں کام کرنے والے لوگوں میں باہمی اختلافات موجود تھے، یوں یہ تنظیم اپنی بنیادی مقصد سے پیچھے ہٹنے لگی۔ اس کے باوجود فی الوقت لوگ کئی نئے مسائل پر لوگوں کو اکٹھا کرنے کیلئے اس تنظیم کا استعمال کرتے رہے۔

کئی منصوبے سودمند ثابت نہ ہو سکے۔ اور کئی مواقعوں پر جب بھی کوئی منصوبہ ناکام ہوا اس تنظیم کے لوگوں کے وہاں کوئی نیا منصوبہ شروع کر دیا۔ یوں منصوبے شروع کرنے اور ان کی افادیت جانچنے سے متعلق اس تنظیم کی ساری انرجی قائم رہی۔ اس تنظیم کے باقاعدہ اجلاس ہوتے تھے جس میں عوام شروع کئے جانے والے منصوبوں سے سیکھے جانے والے اسباق پر تبادلہ خیال کیا کرتے تھے۔ اس بات سے قطع نظر کہ منصوبے کامیاب ہو رہے تھے یا نہیں، یہ عمل جاری رہا۔ یوں ان منصوبوں کی افادیت کے مقابلے میں ان اسباق کی اہمیت کہیں زیادہ تھی جو عوام نے اس دوران سیکھے اور جنہیں مستقبل میں استعمال کیا جانے لگا۔

سگز ویل ایک سیکھنے والا معاشرہ بن چکا تھا۔ ایسے اجتماعی طور پر سیکھے جانے کے عمل کے دوران شہریوں کو اپنی طاقت اور اس کی اہمیت کا بخوابی اندازہ ہونے لگتا ہے۔ اس کی وجہ سے ان کا اجتماعی رویہ تبدیل ہونے لگتا ہے۔ مثال کے طور پر سگز ویل کے علاقے میں یہ منصوبے شروع ہونے کی وجہ سے کاروبار کرنے کا رویہ تبدیل ہو گیا۔ یہ سب تبدیلی آنے کے بعد بھی اس تنظیم کے اجلاس ہو رہے تھے جس نے سب سے پہلے ان مسائل کی نشاندہی کی تھی اور ان کے حل کیلئے کوششیں کرنے کی ترغیب دی تھی۔

جب کوئی معاشرہ کسی مسئلے کے حل کیلئے مل جل کر کام کرتا ہے تو اس دوران شہریوں کو بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔ ہر کوئی جاننا چاہتا ہے کہ آیا کہ یہ منصوبہ کامیاب ہوگا یا نہیں۔ اس بارے میں اخبارات میں باتیں لکھی جاتی ہیں کہ یہ منصوبہ کتنا سودمند رہا یا اس کی وجہ سے کیا نقصان ہوا۔ اس پر لوگوں میں انفرادی سطح پر گفتگو ہوتی ہے۔ باہر کے لوگ اس منصوبے کی نیوٹرل جانچ پڑتال کرتے ہیں۔ لیکن منصوبے میں شامل ہونے والے لوگوں نے شاید

میڈیا کے مواد سے یا ایسے مباحثوں سے اپنے کام کے متعلق کچھ نہیں سیکھا ہوتا۔ کیونکہ وہ تو عملی طور پر اس منصوبے میں شامل رہ چکے ہوتے ہیں۔

ایسے منصوبوں سے عوام کے نا سیکھنے کی وجہ ان کے کام میں ہونے والی بلا وجہ روایتی مداخلت ہو سکتی ہے۔ اگر ان منصوبوں کو ان کی کامیابی کے لحاظ سے بھی دیکھا جائے تو شاید یہ معلوم پڑے کہ عوام نے ان سے کچھ خاص نہیں سیکھا ہوگا۔ سماجی کاموں سے سیکھنے کیلئے ضروری ہے کہ عوام بطور معاشرہ سوچ رہے ہوں۔ صرف کامیابی کے تناسب کا جائزہ لے کر یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ اس منصوبے سے کیا کچھ حاصل کیا ہے۔ اس کی جانچ پڑتال کرنے کیلئے اس سوال کا جواب اس میں شامل کیا جانا چاہئے کہ لوگوں نے آپس میں مل کر کس طرح کام کیا؟ اس سوال کے جواب سے شاید منصوبوں سے متعلق کی جانے والی جانچ پڑتال میں واضح فرق پڑ سکتا ہے۔ ورنہ مالی مدد کرنے والوں کی طرف سے کی جانے والی جانچ پڑتال تو عملی کامیابی تک ہی محدود ہوتی ہے۔

اگر کامیابی کو مخصوص کئے ہوئے ہدف کے حصول تک محدود نہ کیا جائے تو ان منصوبوں سے عوام کے سیکھے گئے اسباق ایک اچھوتا منظر نامہ پیش کرتے ہیں۔ جب عوام کے سیکھنے کی بات سامنے آئے تو جمہوری معاشروں میں منصوبوں کے حاصل کردہ اہداف اور اجتماعی سماجی کوشش دونوں پر بیک وقت بات چیت ہونی چاہئے۔ جب لوگ سیکھنے کے عمل سے گزرتے ہیں تو بعض دفعہ ان کو معلوم ہوتا ہے کہ پہلے جن چیزوں کو وہ عزیز محسوس کرتے تھے دراصل وہ اتنی اہمیت کی حامل نہیں ہیں۔

ایسے منصوبوں میں لوگوں کو سیکھنے کے مواقع صرف اختتام پر ہی میسر نہیں آتے بلکہ وہ اس سارے عمل کے دوران بھی مستفید ہوتے رہتے ہیں۔ کسی منصوبے کو خاص نام دینے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لوگوں کیلئے کونسی چیز اہم ہے۔ کسی معاملے کو عوامی مباحثے کیلئے ایک خاص انداز میں پیش کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو نمٹانے کیلئے کتنے طریقہ کار دستیاب ہیں۔ ان طریقہ کاروں کے مابین کیا چپقلش موجود ہے اور ان سب کے کیا فوائد و نقصانات ہیں؟ یوں مباحثے کے دوران لوگ یہ بھی سیکھتے ہیں کہ کسی خاص ماحول میں کونسے اقدامات کسی معاملے سے نمٹنے کیلئے مناسب ترین ہیں۔ اسی دوران درکار وسائل کی دستیابی اور مسئلے سے ان کی مناسبت کا عمل بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ متبادل منصوبوں کے دوران شہری یہ سیکھتے ہیں کہ کس طرح ایک جیسے کئی ایک منصوبوں کے باہمی تعاون سے معاشرے میں تبدیلی لائی جا سکتی ہے اور کس طرح یہ منصوبے ایک دوسرے کو مکمل کرتے ہیں؟

بعض اوقات لوگوں کا سیکھنے کا عمل مسائل کو دوبارہ سے دیکھنے اور ان کو پیش کرنے کے متبادل انداز تک ہی محدود رہ جاتا ہے۔ یوں حقائق جاننے کے بعد یہ مباحثہ اگلی دفعہ کسی اور سمت میں چلتا ہے۔ اس دوران کئی ایسے سوالات سامنے آتے ہیں۔ کیا ہمیں وہی کرنا چاہئے تھا جو ہم نے کیا؟ یا کیا ہماری طرف سے اٹھائے جانے والے اقدامات ان چیزوں کے مطابق ہی تھے جو ہمیں عزیز ہیں؟

ایسے منصوبوں کا سب سے بڑا فائدہ تو بڑھتی ہوئی سماجی استعداد کار کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ ہینا ایرڈینٹ نے جرمن فلسفہ دان امینل کانٹ کی بات جس میں اس چیز کو انہوں نے 'بڑی ذہنیت' قرار دیا، ذرا مختلف انداز میں بیان کرتے ہوئے کہا کہ لوگ چیزوں کو دوسروں کی نظر سے دیکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ جمہوری نظام میں لوگوں کے سیکھنے سے مراد ان مواقعوں سے فائدہ اٹھانا ہے جن میں وہ انہی مسائل کو کسی دوسرے نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ وہ زندگی میں نئے مواقع تلاش کرنے لگتے ہیں۔ اس کو ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ عوام کا سماجی نقطہ نظر ہی تبدیل ہو جاتا ہے۔

سیکھنے والے معاشروں کو اس طالبعلم سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جو پہلے تو اپنے سارے سلیبس کی پڑھائی کرتا ہے اور اس کے بعد لائبریری جا کر یا انٹرنیٹ پر مزید مطالعہ کرتا ہے۔ یہ معاشرے ایک خاص فارمولے پر عمل نہیں کرتے۔ یہ دوسروں کی پیروی کرنے کی بجائے ان کے کاموں سے سیکھتے ہیں اور اپنے حالات و واقعات کے مطابق اقدامات اٹھاتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنے لئے بہتر روایات خود ترتیب دیتے ہیں۔

ایسے سماجی منصوبے جو فوری نتائج کے حصول کیلئے کام کرتے ہیں وہ اپنا کام مکمل ہونے کے فوراً بعد ہی ختم ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات ایک کوشش کے بعد بھی مسائل اپنی جگہ موجود رہتے ہیں مگر منصوبے ختم کر دیئے جاتے ہیں۔ دوسری جانب کچھ منصوبے مکمل طور پر ناکام ہو جاتے ہیں۔ یوں یہ بھی عوام کو مایوس کرتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کامیابی یا ناکامی دونوں کی صورت میں تقریباً ایک جیسے نتائج سامنے آ سکتے ہیں۔ جب معاشرے سیکھنے لگتے ہیں تو وہ منصوبوں کو کامیابی یا ناکامی کے نقطہ نظر سے نہیں دیکھتے۔ جیسا کہ رڈیارڈ کپلنگ نے بھی لکھا ہے 'دونوں قسم کے نتائج کے ساتھ ایک جیسا سلوک کیا جانا چاہئے۔' اگر کسی منصوبے کے دوران عوام سیکھتے ہیں تو عام طور پر وہ انہیں بعد میں کچھ بہتر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر کوئی منصوبہ ناکام بھی ہو جاتا ہے تو وہ اپنی غلطیوں سے سبق سیکھتے ہیں۔

کسی معاشرے میں سبق سیکھنا محض معلومات کی ترسیل کرنے سے ذرا مشکل عمل ہے۔ یہ سماجی کاوشوں کی جانچ پڑتال کرنے سے کچھ زیادہ کام ہے۔ یہ تبدیلی اور ترقی سے جڑا ہوا ایک نقطہ نظر ہے۔ یہ ایک رویہ ہے جو تجربات کرنے اور ناکامی پر سوچ بچار کرنے سے متعلق ہے۔ ان لوگوں کا کہنا ہوتا ہے کہ 'اگر آپ پہلی دفعہ کامیاب نہیں ہوتے تو بار بار کوشش کریں۔' اور اگر آپ کامیاب ہو بھی جاتے ہیں تو اگلی دفعہ کسی بڑی منزل کے حصول کی کوشش کریں۔ بطور عوام سیکھنے کا عمل دراصل ایک سیاسی رازیہ نگاہ ہے جو جمہوری ثقافت کی ترویج میں کردار ادا کرتا ہے۔

نتیجہ کیا نکلا؟

سگزویل کے عوامی اجتماعات میں مسائل کی نوعیت کے مطابق لوگوں کی شرکت میں اضافہ اور کمی ہوتی

رہی۔ تنظیم کے کچھ لوگوں کو اس تبدیلی سے فکر لاحق ہوئی مگر باقیوں کے مطابق لوگوں کو مباحثے میں شامل کرنے کی بجائے دوسری سماجی تنظیموں سے تعلقات قائم کرنا زیادہ ضروری تھا۔ یہ ارکان قریبی علاقوں اور سرکاری محکموں سے بھی تعلقات بڑھانے کے خواہاں تھے۔ تعلقات کا جال بچھانا ان کی ترجیح بن چکی تھی۔ کچھ لوگ اس تنظیم سے باہر بھی نکل گئے کیونکہ ان کے مطابق تنظیم کو کچھ اور کام سرانجام دینے چاہیئے تھے۔ لیکن اس سماجی تنظیم نے مقامی انتظامیہ کے انتخابات اور حکومت سازی کے عوامل میں شامل ہونے سے انکار کر دیا۔

اس حد تک تبدیل ہو جانے کے باوجود سگز ویل کوئی مثالی علاقہ نہیں ہے۔ جس کو دوسروں کے سامنے بطور نمونہ پیش کیا جا سکے۔ یہ علاقہ بدل چکا ہے۔ یہاں کے شہری اپنے مستقبل پر بڑی حد تک اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ جب وہاں کے ایک رہائشی سے پوچھا گیا کہ انہوں نے اس سارے سماجی عمل کے دوران کیا سیکھا تو ان کا کہنا تھا 'ہم نے آپس میں مل کر کام کرنا سیکھا ہے'۔

پیدا ہونے والی تبدیلی کو پروان چڑھانا

سگز ویل میں سامنے آنے والی پیش رفت دراصل انہی چیزوں کی وجہ سے سامنے آئی جو پہلے ہی سے اس علاقے میں موجود تھیں یا وہ صلاحیتیں جو حقیقت میں منتقل ہونے کی منتظر تھیں۔ شہریوں کی طرف سے کام کرنے کیلئے چنا گیا طریقہ کار بھی وہی تھا وہ جو عوام کا معمول تھا۔ لوگ پہلے ہی درپیش مسائل پر بات چیت کر رہے تھے۔ ان میں بحث جاری تھی کہ یہ مسائل انہیں کس طرح متاثر کر رہے تھے۔ کمیونٹی میٹنگ کی وجہ سے تو یہ معاملات ایک باقاعدہ مباحثے کا حصہ بن گئے جہاں انہیں ایک نئے سرے سے دیکھا گیا اور انہیں ایک مختلف انداز سے پیش کیا گیا۔ تا کہ ان معاملات میں عام لوگوں کو شامل کر کے مسائل کا حل نکالا جا سکے۔

اس علاقے کے مسائل کو حل کرنے کیلئے درکار وسائل بھی غیر متوقع جگہوں سے میسر آئے۔ یہاں تک بچوں کو بڑھانے کے معاملے میں بھی عام لوگوں کی مدد میسر آئی۔ اسی طرح جان میک نائٹ اور جان کریٹسمین نے بھی اپنی ریسرچ میں یہ کہا کہ 'ضروریات پر دھیان دینے کی بجائے نظر انداز کیئے جانے والے وسائل کے استعمال سے زیادہ طاقت دستیاب ہوتی ہے'۔ سگز ویل کے مسائل میں کے پیچھے بھی شاید ایک یہی وجہ تھی کہ وہ مسائل کے روایتی حل پر نظر دوڑاتے تھے۔ ایک ایسا قصبہ جہاں لوگ پہلے جانتے تھے کہ وہ کیا کیا کچھ نہیں کر سکتے، وہاں کے لوگوں نے اتنا سب کچھ کر دکھایا۔ اور یہ سب انہوں نے اکیلے ہی نہیں کیا۔ انہیں باہمی امداد حاصل تھی اور انہیں آس پاس کے علاقوں کا تعاون بھی ملا۔ لیکن عوام نے کام کا آغاز خود سے ہی کیا تھا۔ ان لوگوں نے اپنے کام کیلئے 'اجتماعی افادیت' کا لفظ استعمال نہ کیا ہو مگر دراصل وہ اسی پر کاربند تھے۔ نتیجتاً سگز ویل سیاسی ماحول میں تبدیل ہو گیا۔ وہاں کے لوگوں کا کاروبار کرنے کا طریقہ کار تبدیل ہو گیا۔ اور انہوں نے جمہوری معاشروں کیلئے ایک مثال قائم کی کہ 'ہمیشہ پہلے سے موجود وسائل اور پہلے سے وقوع پذیر ہونے والے واقعات سے کام کا آغاز کرنا چاہیئے'۔

یہاں یہ بات بھی اہم ہے کہ سگز ویل میں جن روایتوں کو پروان چڑھایا گیا وہ انفرادی سطح پر نہیں تھیں۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ بہترین نظر آتی تھیں۔جس طرح روس میں پایا جانے والا ایک پرندہ جس کا نام میٹریز کا ہے، اپنے گھونسلے میں نظر آتا ہے۔اس باہمی تعلق کے سبب ان کاموں کو ایک نئے طریقے سے کرنے کے مواقع بھی میسر آئے۔جب کسی مسئلے کو عوامی مباحثے میں پیش کیا گیا تو اس پر اس وقت تک غور وفکر کیا جاتا رہا جب تک اصل معاملے کا پتہ نہیں چل جاتا تھا۔یہاں تک کہ جب وہ کسی فیصلے پر عمل کرنے کی طرف بھی بڑھنے لگتے تو اپنے طریقہ کار اور مسئلے کے نام پر نظر ثانی کرتے رہتے۔اور جب وہ بات چیت کرتے تو لوگ مباحثے میں مسائل کے مجوزہ حل پر کھل کر بولتے۔وہ اس عزم کا بھی بھرپور اظہار کرتے جو مسائل سے نمٹنے کیلئے درکار ہوتا تھا۔وہ ماضی کی کوششوں سے سبق سیکھتے۔وہ عمل اور مباحثہ دونوں کو ساتھ ساتھ لے کر چلتے۔اور اس سارے عمل کے دوران وہ سیکھنے میں مصروف رہتے۔

’جو کچھ پیدا ہوتا ہے اس کو پروان چڑھاؤ‘۔۔۔جے ہرمین بلیک

☆☆☆☆

باب دہم

جمہوری روایات

سگز ویل کی کہانی سے کم از کم چھ ایسی روایات کا پتہ چلتا ہے جن کی مدد سے کسی بھی جمہوری معاشرے میں شہریوں کے ہاتھ مضبوط کئے جا سکتے ہیں۔ یہ کام سرانجام دینا اس صورت میں انتہائی لازم ہے اگر شہری خومختار ہونا چاہتے ہیں یا اپنے حکمران خود بننا چاہتے ہیں۔ میں ایک بار پھر سے کہنا چاہتا ہوں کہ یہ روایات انفرادی سرگرمیاں نہیں ہیں بلکہ یہ آپس میں جڑی ہوئی ہیں۔ دراصل تو یہ ایک الگ قسم کی سیاست ہی ہیں۔

میں ان روایات کو ایک چارٹ کی صورت میں بیان کرنا چاہتا تھا مگر پھر میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ اس سے تاثر ملے گا کہ یہ اقدامات تو دراصل وہی ہیں جو ایک گروپ کو ایک ساتھ کام کرنے کی صورت میں بطور ہدایات بتائے جاتے ہیں۔ انہیں ان پروگرامات کے ساتھ بھی تشبیہ دی جا سکتی ہے جنہیں منصوبہ بندی کے دوران لوگ استعمال میں لاتے ہیں۔ مگر یہ روایات کوئی ہدایت نامہ یا اوزار نہیں ہیں بلکہ یہ ایسے کام ہیں جن کی مدد سے جمہوری روایات پروان چڑھائی جاتی ہیں۔ جن کی مدد سے لوگوں میں سیکھنے کے عمل کا آغاز ہوتا ہے اور نتیجتاً وہ اپنے کئی مسائل کو بذات خود ہی نمٹانا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ بیک وقت سیکھنے اور عمل کرنے کے طریقے ہیں۔ یہاں میں ان چھ طریقوں کا تذکرہ کر رہا ہوں جو میری نظر میں اہم ہیں:

☆ سب ضروری کام کسی مسئلے کو مناسب ترین نام دینا ہوتا ہے۔ ایک ایسا نام جو ان چیزوں کی ترجمانی کرتا ہے جنہیں لوگ عزیز تصور کرتے ہیں۔ یہ صرف ماہرانہ معلومات اور رائے پر مبنی نہیں ہوتے بلکہ عوام کے جذبات کی بھی ترجمانی کرتے ہیں۔

☆ دوسرا اہم ترین کام کسی مسئلے کو بہترین انداز میں مباحثے کیلئے پیش کرنا ہے۔ ایک ایسا طریقہ کار جس میں مسائل کو اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ لوگوں کی عزیز ترین چیزوں کی نشاندہی ہو سکے اور ان مسائل سے نمٹنے کیلئے کئی ایک آپشنز بھی تفصیلاً بیان کئے جا سکیں۔ اس عمل کے دوران ان آپشنز کے مابین موجود چپقلش کو بھی بیان کیا جانا چاہئے۔ یوں انتہائی ایمانداری سے تمام آپشنز کے فوائد اور نقصانات بھی عوام کے سامنے رکھے جاتے ہیں۔

☆ فیصلہ سازی کیلئے عوامی مباحثے منعقد کروانا تاکہ کئے جانے والے فیصلے سارے معاشرے کی اجتماعی عکاسی کر سکیں۔ ابتداء سے لے کر مکمل عمل درآمد تک بات چیت کا عمل جاری رہنا چاہئے۔

☆ منصوبوں پر عمل درآمد کیلئے وسائل کی نشاندہی کرنا اور ان کی فراہمی کیلئے وعدے کرنا۔ اس عمل کے دوران پہلے سے نظرانداز کئے گئے وسائل کو خاص ترجیح دی جانی چاہئے۔

☆ پانچویں مرحلے میں مختلف منصوبوں پر اس انداز میں کام کیا جاتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے متبادل بن جائیں۔ یوں یہ سب منصوبے ایک دوسرے کے مددگار بن جائیں اور مجموعی طور پر معاشرتی ترقی کا باعث بنیں۔

☆ سب سے آخری اور انتہائی ضروری کام اس سارے عمل سے بطور معاشرہ سیکھنا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ سماجی کاموں میں حصہ لینے کا عزم قائم رہے۔

یہ روایات دراصل انہی سوالوں کے جوابات ہیں جو مسائل کے شکار معاشروں میں اٹھائے جاتے ہیں۔ لوگ جاننا چاہتے ہیں کہ وہ کس طرح بطور معاشرہ مل کر کام کر سکتے ہیں؟ وہ کس طرح اپنے مابین موجود فرق کو کم کر سکتے ہیں اور کیسے وہ اپنے معاشرے کو بچا سکتے ہیں؟ ان سوالات کے جواب میں وہ کسی سماجی تنظیم یا سرکاری ادارے کا نام نہیں سننا چاہتے بلکہ وہ یہ کام خود سرانجام دینا چاہتے ہیں۔ وہ صرف ان سوالات کے جوابات جاننے کا طریقہ تلاش کر رہے ہوتے ہیں۔ ان سوالات کے جوابات ڈھونڈنے کا آسان ترین طریقہ ان وسائل پر نظر دوڑانا ہے جن کو پہلے نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔ یوں کاروبار کو سیاسی طریقے سے چلا کر معاشرے میں تبدیلی لائی جا سکتی ہے۔

باقاعدہ سیاسی جلسے کئے بغیر سیاسی عمل کا حصہ بننا

پہلے بیان کی گئی چھ روایات سے ایک ایسا سیاسی عمل جنم لیتا ہے جو کسی خاص علاقے سے جڑا نہیں ہوتا۔ عام طور پر لوگوں کو سیاسی عمل کا حصہ بننے کیلئے ایک خاص جگہ پر جانا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر لوگ ووٹ ڈالنے جاتے ہیں یا کسی مقامی عدالت کا حصہ بنتے ہیں۔ اس کے برعکس جمہوری روایات کہیں سے بھی شروع کی جا سکتی ہیں۔ ان کیلئے کسی مخصوص جگہ پر جانا درکار نہیں ہوتا۔ اس عمل کیلئے کافی شاپ، خرید و فروخت کے مراکز اور گھر کے پچھلے صحن کی مثالیں پہلے ہی دی جا چکی ہیں۔ تقریباً تمام ہی ایسی جگہیں جہاں لوگ روزمرہ کے کاموں کے سلسلے میں جمع ہوتے ہیں اس عمل کا آغاز کیا جا سکتا ہے۔ ایسی جگہیں جو صرف ایک جلسے، کلاس یا رکن سازی تک محدود نہ ہوں، اس صورتحال میں زیادہ مددگار ثابت ہوتی ہیں۔

میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ جمہوری روایات پر عمل کرنے سے بھی ان روایات کی ترویج کی جگہ پیدا ہوتی ہے۔ اس کیلئے کسی گلی میں جلسہ منعقد کر کے اس سے خطاب کرنا ضروری نہیں ہوتا بلکہ یہ تو روزمرہ کے کاموں کے دوران ملنے والے مواقعوں سے فائدہ اٹھانے کا نام ہے۔ سگز ویل کی مثال میں دیکھیں انہیں کتنے زیادہ مواقع اور جگہ میسر آتی گئی۔ یہ عمل شروع ہو تو عام سی جگہیں عوامی جگہیں بنتی چلی جاتی ہیں۔

روزمرہ زندگی میں منتخب کرنے کا حق ہی جمہوری عمل کی سب سے بڑی نشانی کے طور پر پیش کیا جا سکتا

ہے۔اس بات کا احساس ہونا کہ ہم چھوٹی سے چھوٹی چیزوں کو منتخب کرنے میں آزاد ہیں،ہمیں پہلے سے زیادہ طاقتور بناتا ہے۔یہ ہمیں آزادخیال بناتا ہے اور ہمیں ایک ایسے ماحول سے باہر نکالتا ہے جس میں ہم اپنے آپ کو بے بس اور دبا ہوا تصور کرتے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ ایک معاشرہ وہاں کے لوگوں کے کیئے گئے انتخاب کے نتیجے میں ہی ترتیب پاتا ہے۔ چاہے ان چیزوں کا انتخاب اس عمل کو باقاعدہ طور پر سمجھے بغیر ہی کیا گیا ہو۔

کسی بھی معاشرے میں جمہوری روایات کی ترویج کی راہ میں حائل مشکلات کا تذکرہ کیئے گئے ان مواقعوں کی بات کرنا فضول امر ہے۔ہمیں روزمرہ کے معاملات میں تبدیلی لانا مشکل نظر آتا ہے اور بعض اوقات تو ان روایات پر عمل کرنا بذات خود ایک مشکل عمل ہوتا ہے۔

لیکن شہری نہیں کر سکتے۔۔۔

عام طور پر پایا جانے والا تاثر کہ لوگ نہ تو کوئی کام کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں اور نہ ہی انہیں اس عمل میں کوئی دلچسپی ہے، اس وقت مکمل طور پر غلط نظر آتا ہے جب مقامی لوگ اپنی کوششوں کیوجہ سے کوئی تبدیلی برپا کر دیتے ہیں۔اس کے ساتھ ہی کسی جمہوری معاشرے میں بہتری لانے سے متعلق کئی دیگر باتیں بھی غلط ثابت ہو جاتی ہیں جو معاشرے میں بری طرح سرایت کر چکی ہیں۔سماجی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والے لوگ دو مزید باتوں کو بھی غلط ثابت کرتے ہیں۔جن میں سے پہلی بات تو یہ ہے کہ عوام کی طرف سے کیا جانے والا کام اتنے بڑے پیمانے پر نہیں ہوتا کہ اس کو کوئی اہمیت دی جا سکے یا اس کو کوئی اہم تبدیلی خیال کیا جائے۔دوسرے نمبر پر اس ذہنیت کو بھی شکست کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس کے مطابق تبدیلی تو صرف لیڈر لاتے ہیں نہ کہ عوام۔

لیکن میں اس تنقید کو بلاوجہ تصور نہیں کرتا۔ دوسری جانب میرا یہ بھی ماننا ہے کہ عوامی مباحثہ، سماجی گروہوں کے مابین رابطہ اور ان کا عزم انہیں اپنا نیٹ ورک مزید بڑھانے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔جس کی مدد سے وہ پہلے سے موجود نظام کو بھی متاثر کر سکتے ہیں۔اور ایسے منصوبوں میں لیڈر کی کمی بھی یہی جمہوری روایات پوری کرتی ہیں۔یوں ان روایات پر عمل کر کے پورا سماج ہی لیڈر کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جمہوریت اور جمہوری روایات کو چلنے کیلئے ایک خاص ماحول کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر کہا جاتا ہے کہ اس نظام کی کامیابی کیلئے معاشرے میں اعتماد کی فضا اور باہمی تعاون درکار رہتا ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ان میں سے کسی ایک کی کمی جمہوری نظام کیلئے رکاوٹیں کھڑی کر سکتی ہے۔لیکن یہاں میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ یہ عوامل جمہوری نظام کیلئے شرط نہیں بلکہ یہ تو خود جمہوری نظام کے ہی ثمرات ہیں۔

جمہوری نظام کا سب سے بڑا ثمر جمہوری رویہ رکھنے والے عوام ہوتے ہیں۔یا یوں کہنا چاہئے کہ جمہوری

روایات کے عمل کے نتیجے میں ایسے لوگ پیدا ہوتے ہیں۔اور جمہوری روایات انہی لوگوں کی عمل داری کا مظاہرہ ہوتی ہیں۔

کیا اتنا کافی ہے؟

اگر جمہوری روایات کو صرف چند میٹنگز تک محدود کر دیا جائے تو شاید ان پر عمل درآمد کا کوئی خاص فائدہ نہیں ہو سکے گا۔ کیونکہ انہیں ایک چھوٹے پیمانے پر دہرایا جائے گا۔ جو کہ کسی صورت زیادہ اہمیت کا حامل نہیں ہو سکتا۔لیکن میرا خیال ہے کہ اس ضمن میں تنقید کرنے والے لوگ یہ بات نظر انداز کر دیتے ہیں کہ ان جمہوری روایات کی بدولت ہی معاشرے میں پیدا ہونے والے باہمی تعلقات کو بڑے پیمانے تک بڑھایا جا سکتا ہے۔ قدرتی ماحول میں ایسا عمل ہر صورت وسعت اختیار کرتا ہے۔رابطہ قدرتی طور پر پائی جانے والی چیزوں کی جان ہے۔ہم دیکھتے ہیں کہ چھوٹے چھوٹے سیلز آپس میں مل کر پودے اور جانور تشکیل دیتے ہیں۔اسی طرح سمندر میں پائے جانے والے چھوٹے چھوٹے کورلز خود تو بڑے نہیں ہو سکتے مگر وہ آپس میں جڑ کر ایسا نیٹ ورک ضرور تشکیل دیتے ہیں جو مضبوط ہوتا ہے۔سماجی تعلقات بھی اسی طرح کام کرتے ہیں۔اور آج کی دنیا کو تو ویسے ہی گلوبل ولیج کا نام دیا گیا ہے جو آپس میں مختلف طرح کے رابطے رکھتی ہے۔ایک چھوٹے سے گروہ یا کسی ایک شخص کی طرف سے کئے جانے والے کام محدود پیمانے تک ہی نہیں رہ جاتے بلکہ وہ باقی دنیا کے علم میں بھی آتے ہیں۔سابق برطانوی سفیر کارنی روس نے بھی اپنی عملی زندگی میں کچھ اسی طرح کے مشاہدات کئے۔

تعلق اور رابطہ

کچھ معاشروں میں ایسا کیا موجود ہوتا ہے کہ وہ کسی چیلنج کے بعد ڈوب کر دوبارہ ابھرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں جبکہ باقی معاشروں میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی؟ اس سوال کا جواب اس معاشرے کے لوگوں کے باہمی اور دیگر معاشروں کے ساتھ تعلقات کی نوعیت سے جڑا ہوا ہے۔معلومات کی ترسیل بھی اس عمل کو متاثر کرتی ہے۔

سین سیفرڈ نے اپنی تحقیق میں پینسلوینیا کے علاقے ایلن ٹاؤن کے مکینوں کے سماجی رابطوں کا موازنہ اوہائیو کے علاقے ینگز ٹاؤن کے رہائشیوں کے ساتھ کیا ہے۔دونوں علاقے ترقی کی بلندیوں کو چھو رہے تھے کہ انہیں 1970 کی دہائی کے اواخر اور 1980 کی دہائی کے اوائل میں تقریباً ایک جیسے معاشی نقصانات کا سامنا کرنا پڑا۔ایلن ٹاؤن کے لوگوں نے اس صورت حال پر زیادہ بہتر ردعمل دیا۔کیونکہ وہاں کے لوگوں کے مابین ماجود رابطے کے ذرائع زیادہ بہتر تھے۔اس کے ذریعے معاشرے کے مختلف حصے آپس میں جڑے ہوئے تھے اور یوں عوام کو سکھانے اور معلومات کی ترسیل میں آسانی رہی۔

اس کے مقابلے میں ینگز ٹاؤن کے لوگوں کے مابین موجود سماجی رابطے کسی خستہ حال گاڑی کے پہیوں جیسے تھے۔تمام تر رابطے کے ذرائع ایک مرکزی سینٹر سے جڑے ہوئے تھے، جہاں ہر قسم کی معلومات پہنچتی تھیں اور

پھر دوسرے مرحلے میں ان کو شہر کے دیگر حصوں میں بھیجا جاتا تھا۔ ایلن ٹاؤن میں ایسا نہیں تھا۔ وہاں رابطے کے کئی مراکز تھے جن کی وجہ سے لوگوں میں زیادہ موثر بات چیت تھی۔ جس کی بدولت سیاسی، سماجی اور معاشی حلقے زیادہ متحرک تھے۔ یوں ہر کوئی ایسے ہی معلومات حاصل کر سکتا تھا جس طرح آج کے زمانے میں انٹرنیٹ کی بدولت ممکن ہے۔

جمہوری روایات نے بھی ایلن ٹاؤن کے کمیونیکیشن کے نظام کو سپورٹ کیا کیونکہ وہ صرف ایک ہی جگہ پر مرکوز نہیں تھا۔ ایسی کوئی طاقت موجود نہیں تھی جو اس ضمن میں معاونت کرتی۔ یوں ہر گروہ نے مختلف منصوبے شروع کئے اور باہمی تعاون موجود نہ ہونے کے باوجود یہ منصوبے ایک ہی سمت میں تھے۔ یہ تمام منصوبے تقریباً ایک ہی مقصد پورا کر رہے تھے۔ وہ ایک دوسرے کیلئے متبادل کا کام بھی دے رہے تھے۔ کسی مسئلے کو لوگوں کی عزیز چیزوں کے مطابق نام دینا لوگوں کو ان مسائل سے متعلق حساس بناتا ہے۔ اس مسئلے پر عوامی مباحثہ معاشرے میں موجود وسائل کی نشاندہی کرتا ہے اور یوں ایک ہی سمت میں چلنے والے مختلف منصوبے شروع ہوتے ہیں۔

ایک ہی معاشرے میں موجود ایسے چھوٹے چھوٹے منصوبے جن میں باہمی رابطہ موجود ہو ایک ایسا سماج ترتیب دیتے ہیں جو ڈوب کر ابھرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ کسی ایک چیز پر انحصار نہیں کر رہا ہوتا جس کی وجہ سے اس کی ناکامی کے امکانات بھی کم ہوتے ہیں۔ آپ سوچیں کہ ایک پانچ سو پاؤنڈ وزن کا ابیا دلدل کے ساتھ کیا کر سکتا ہے۔

قیادت کون کرے گا؟

جمہوری روایات ان باتوں کی بھی نفی کرتی ہیں کہ کسی معاشرے میں تبدیلی برپا کرنے کیلئے وہاں موثر قیادت کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ جو باہر نکلتے ہیں ساری طاقت کو درست سمت میں استعمال کرتے ہیں۔ یہ بھی سوال کیا جاتا ہے کہ کس طرح صرف عام شہری ہی مل کر کام کر سکتے ہیں اور کوئی تبدیلی برپا کر سکتے ہیں؟ تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے جہاں کسی لیڈر نے مرکزی کردار ادا کر کے معاشروں کو تبدیل کیا۔ ان لوگوں میں ابراہم لنکن، مارٹن لوتھر کنگ جونیئر، جارج واشنگٹن اور سوزن انیتھونی جیسے لوگ شامل تھے۔

اس بات پر تو کوئی دورائے ہو ہی نہیں سکتیں کہ لیڈرز منصوبوں کی کامیابی میں انتہائی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ جمہوری نظام میں بھی کوئی ایسا ہوتا ہے جو پہل کرتا ہے۔ پھر معاشرے میں موجود جمہوری روایات اس کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔ لیکن یہ لوگ پورے معاشرے کو لیڈر بناتے ہیں نہ کہ یہ خوبی چند لوگوں تک محدود کر دیتے ہیں۔ قیادت کر لینا ایک مضبوط جمہوری معاشرے کی ایک اور بڑی نشانی ہے۔ ان روایات پر عمل کرنے کے دوران معاشرے کے ہر حصے سے عظیم لوگ اس کا حصہ بن جاتے ہیں۔ ہر ایک کیلئے کوئی کردار ہوتا ہے جو انہیں ادا کرنا ہوتا ہے۔ کچھ لوگ پہلے سے موجود مسئلے کو کوئی نیا نام دینے کی تجویز دیتے ہیں۔ کچھ لوگ پیدا ہونے والی

مصیبتوں کیلئے تدارک بتاتے ہیں۔ مسائل کو حل کرنے کے عمل کے دوران تقریباً ہر کوئی ہی اپنی رائے کا بھرپور اظہار کرتا ہے۔ کئی لوگ وسائل دستیاب کرتے ہیں۔ اور پھر منصوبوں کی جانچ پڑتال کرنے میں تو ہر کوئی حصہ دار بن سکتا ہے۔

ایک ریسرچ جس میں دو معاشروں کا اس نکتے پر تقابلی جائزہ لیا گیا تھا کہ وہاں کے لوگ مسائل سے کیسے نمٹتے ہیں؟ یہ بات سامنے آئی کہ ایک علاقہ جہاں کئی بڑے بڑے لیڈرز موجود تھے وہاں کے لوگ مسائل کو بہتر انداز میں نمٹنے میں ناکام رہے تھے جبکہ دوسرے علاقے میں لوگ بخوبی مسائل کا مقابلہ کر رہے تھے۔ یہ لیڈرز اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور وہ ذاتی لحاظ سے کامیاب انسان تھے۔ لیکن اس کے باوجود ان کے معاشرے نے وہ ردعمل نہیں دکھایا جو دوسرے معاشرے نے دکھایا تھا۔ دراصل دوسرے معاشرے میں موجود ہر کوئی شخص اپنے لوگوں کو مطلوبہ قیادت فراہم کرسکتا تھا۔ کیونکہ وہ جمہوری روایات پر عمل پیرا معاشرہ تھا۔

ازخود حکمران معاشرے میں کسی کام کی ابتداء کرنا آسان کام نہیں ہوتا کیونکہ یہاں کچھ بھی خود بخود نہیں ہو رہا ہوتا۔ ایسے معاشرے جو جمہوری طور پر مضبوط ہیں وہاں کا ہر فرد ہی لیڈر بن سکتا ہے اور کوئی نیا منصوبہ شروع کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ ایسے معاشرے ایسی خوبیاں ہر فرد میں پیدا کردیتے ہیں نہ کہ انہیں چند افراد تک محدود کر کے رکھ دیں۔ تاہم یہ لوگ لیڈروں کی طرح کوئی خاص طاقت استعمال نہیں کرسکتے ہوتے۔

ایسے معاشروں میں منصوبوں کا آغاز کرنے والے لوگ دوسرے لوگوں کے ساتھ تعلقات رکھنے میں ذرا مختلف ہوتے ہیں۔ وہ دروازے بند رکھنے کی بجائے نئے نئے دروازے کھولنے والے لوگ ہوتے ہیں۔ یہ لوگ رابطہ سازی کے ماہر ہوتے ہیں۔ روایتی لیڈرز مالی وسائل اور اپنی قانونی حیثیت کو استعمال کرتے ہیں جس کی مدد سے وہ مقامی سماجی منصوبے مکمل کرتے ہیں۔ اس کے برعکس یہ لوگ لوگوں سے رابطے قائم کرتے ہیں اور ان کو منصوبے میں شامل کرتے ہیں۔ یہ مسائل کو حل کرنے کیلئے صرف اشرافیہ اور لیڈرز کی بجائے عام لوگوں کی طرف دیکھتے ہیں۔

ہینرک ابسن کا کہنا ہے کہ 'ایک معاشرہ کسی بحری جہاز کی طرح ہوتا ہے، جہاں ہر کارندے کو اس طرح تیار کیا جاتا ہے کہ وہ جہاز کے پتوار سنبھال سکے۔ معاشرے کے موجود مسائل کے پیش نظر ایک معاشرے کو محدود تعداد میں لیڈرز کی بجائے کچھ زیادہ کی ضرورت ہے۔ یوں ضرورت اس امر کی ہے کہ شہری اور لیڈر دونوں ہم معنی الفاظ تصور کئے جانے لگیں۔

مزید مسائل

درحقیقت جمہوریت کو درپیش مسائل کی تعداد اس سے کہیں بڑھ کر ہے جنہیں ابھی تک اس کتاب میں

بیان کیا گیا ہے۔ایک اور بڑا مسئلہ لوگوں اور اداروں کے مابین پایا جانے والا عدم اعتماد ہے۔ جمہوری نظام کو ماحولیات سے تشبیہ دینے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کی وجہ سے معاشرے میں موجود مختلف چیزوں کے آپس میں تعلق کی اہمیت کو اُجاگر کیا جا سکے۔ اگلے دو بابوں میں اسی معاملے پر بات چیت کی جائے گی۔لیکن اس مسئلے سے نمٹنے کیلئے کوئی ایک طریقہ ہی سودمند نہیں ہے۔ کسی معاشرے سے عدم تعاون کی فضا کو ختم کرنے کا تعلق اس سوال سے ہے کہ وہاں کے لوگ اور سارے دیگر جمہوری روایات کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں؟ وہ ان سب کو ایک ساتھ چلاتے ہوئے کیا کرتے ہیں؟ شہری سیاست اور سرکاری اداروں کے معاملات دو مختلف عوامل ہیں مگر یہ دونوں ایک دوسرے کیلئے مددگار ہوتے ہیں۔

☆☆☆☆

حصہ سوم

ادارے، ماہرین اور عوام

باب گیارہ

اختلافات کی خلیج کو پر کرنا

عوام اور اداروں کے مابین موجود خلا ایک لمبے عرصے سے موجود ہے اور اب تو یہ خلیج کئی گنا وسعت اختیار کر چکا ہے۔ امریکی عوام میں سے پچاس فیصد سے بھی کم لوگوں کو ان سرکاری اداروں پر اعتماد ہے۔

دوسرے اداروں کے مقابلے میں صحت عامہ کے شعبہ کو امریکی عوام کا سب سے زیادہ اعتماد حاصل ہے اور وہ بھی صرف تین تہائی امریکی عوام کیلئے قابل اعتماد ہے۔ امریکی کانگرس کا درجہ ان اداروں میں سب سے نیچے ہے اور صرف 6 فیصد امریکی ہی اس پر اعتماد کا اظہار کرتے ہیں۔ قانونی اداروں پر اعتماد کرنے کی شرح بھی بری طرح متاثر ہو چکی ہے۔ وال سٹریٹ پر اعتماد کرنے والے امریکی بھی محض 7 فیصد کی کم ترین شرح تک آ چکے ہیں۔ اسی طرح بڑی بڑی کمپنیوں سے متعلق بھی محض ایک چوتھائی امریکیوں کا کہنا ہے کہ وہ ان اداروں پر کسی حد تک اعتماد کر سکتے ہیں۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ عدم اعتماد کی کی شرح مسلسل بڑھتی جا رہی ہے اور عوام اور اداروں کے مابین بڑھتے ہوئے اس خلا کی وجہ سے ان اداروں کے قانونی استحقاق پر بھی سوالات پیدا ہو رہے ہیں۔ کیونکہ یہ ادارے عوام کا اعتماد کھو کر تو کام ہی نہیں کر سکتے۔

عدم اعتماد کا بڑھتا ہوا یہ رجحان سکولوں، اعلیٰ تعلیمی اداروں اور غیر سرکاری سماجی اداروں سے متعلق عوامی رائے کو بھی متاثر کرتا ہے۔ اور اس سے بڑھ کر خطرے کی بات یہ ہے کہ یہ عدم اعتماد کا اظہار دو طرفہ ہے۔ جس طرح عوام اداروں پر اعتماد کرنے میں مشکل کا شکار ہیں اسی طرح ادارے بھی عوام پر اعتماد کرنے کو تیار نظر نہیں آتے۔ یوں دو طرفہ اعتماد کے فقدان کے سبب بھی عوام اور اداروں میں موجود خلا پر ہونے کو نہیں آ رہا۔

ایسا ہونے کی وجہ کیا ہے؟ ظاہر ہے اس کی کئی ایک وجوہات ہیں۔ جیسا کہ اداروں سے کچھ زیادہ ہی توقعات وابستہ کر لینا۔ اس حد تک کہ ان توقعات کو پورا کرنا اداروں کے بس میں ہی نہ ہو۔ اس عدم اعتماد سے متعلق عوام میں بھی کچھ آراء پائی جاتی ہیں جیسا کہ عوام سمجھ ہیں کہ ادارے موثر طریقے سے کام کرنے میں ناکام ہیں لہذا اس کے نتیجے میں عوامی عدم اعتماد کی شرح بڑھ رہی ہے۔ عوام میں یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ سرکاری ادارے وہ کام سر ے کرتے ہی نہیں ہیں جن کی وجہ سے انہیں تشکیل دیا گیا تھا۔

اس تنقید میں بھی ایک خاص تعلق قائم کیا جا سکتا ہے۔ اگر ادارے اپنا کام موثر انداز میں سرانجام دے رہے ہوں تو نتیجتاً عوام ان پر اعتماد کرنے لگتے ہیں۔ اور کچھ ادارے مثال کے طور پر سکول وغیرہ کو اس وقت موثر خیال کیا جائے گا جب یہ عوامی توقعات پوری کر رہے ہوں اور عوام بھی ان سے بھرپور تعاون کر رہے ہوں۔ شاید عوامی شمولیت سے اداروں کی استعداد کار میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔ میں اس کے بارے میں آگے چل کر مزید بات کروں گا۔ مگر اس سے پہلے میں عوام اور اداروں میں موجود اختلافات کی نوعیت کا ذرا بہتر انداز میں جائزہ لینا چاہتا ہوں۔

اداروں سے متعلق پائی جانے والی منفی آراء کی وجوہات تلاش کرنا مشکل نہیں ہے۔ ہم سب نے ہی بد عنوان سیاستدان، نااہل استاد، کرپٹ افسر اور بیوکریسی کی کھینچا تانی کی کہانیاں سن رکھی ہوتی ہیں۔ اس کے باوجود کہ کئی متاثر کن لوگ سیاستدان بنتے ہیں۔ اسی طرح سرکاری افسران پر اعلیٰ تربیت یافتہ افراد ہی ہوتے ہیں۔ پھر یہ عدم اعتماد کیوں ہے؟

شاید اس کی سب سے بڑی وجہ اداروں کی بجائے خود عوام سے جڑی ہوئی ہے۔ لوگ اداروں کی طرف سے مناسب ردعمل کے ساتھ ساتھ کچھ مزید بھی چاہتے ہیں۔ وہ اپنے مستقبل پر زیادہ سے زیادہ قابو پانا چاہتے ہیں تاکہ وہ آنے والے برے وقت اور غیر متوقع واقعات سے بچ سکیں۔ کسی بھی ادارے کے ساتھ قائم ایک ایسا تعلق جو انہیں ایسے معاملات پر زیادہ قابو نہیں دیتا، کافی نہیں ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ یہ تعلق کتنا ہی ضروری اور مثبت کیوں نہ ہو اعتماد کی فضا قائم نہیں ہو سکتی۔

'ہمارے شہری ہماری حکومت اور ہمارے اداروں کو دوبارہ زندگی عطا کر سکتے ہیں۔ انہیں مزید موثر بنا سکتے ہیں۔ ان کا احتساب کر سکتے ہیں اور انہیں ایماندار بنا سکتے ہیں۔ عوام کے بغیر یہ کام کوئی بھی نہیں کر سکتا' ۔۔۔ جان گارڈنر

اعتماد کی بحالی کی راہ میں موجود رکاوٹیں

عوام اور اداروں کے درمیان اعتماد کی بحالی کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ایک رکاوٹ سماجی یا جمہوری لوگوں اور اداروں میں موجود لوگوں کی ذہنیت میں فرق بھی ہے۔ میرا ہرگز مطلب یہ نہیں ہے کہ میں انفرادی طور پر ماہرین پر تنقید کروں۔ ہم تمام ہی لوگ ڈاکٹروں، وکیلوں، انجینئرز اور دیگر ماہرین کی صلاحیتوں کی تعریف کرتے ہیں۔ تاہم اس وقت میری باتیں جمہوری کلچر سے متعلق ہیں کہ ماہرین اس نظام اور جمہوریت پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں۔

عوامی اور سرکاری اداروں کو ایسے ماہرین جو کسی سیاسی دباؤ یا مصلحت کا شکار نہ ہوں، کے ہاتھوں میں دینے کا مقصد یہ تھا کہ اس کی وجہ سے عوام کو فائدہ ہوگا۔ لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔ اس کی وجہ یہ سوچ ہے کہ موجودہ دنیا میں صرف ماہرین ہی کی رائے سب سے معتبر ہوتی ہے۔ یہ سوچ ماہرین کو ملنے والی قانونی طاقت کے علاوہ انہیں ایک خاص قسم کی اضافی اور غیر ضروری طاقت بھی فراہم کرتی ہے۔ اس طاقت کا مرکز تکنیکی توجیہہ کارہوتی ہے۔ یہاں تکنیکی توجیہہ کا لفظ استعمال کرنے کا مقصد یہ کہنا ہے کہ اس کی وجہ انسانی معاشرہ مشین کی سی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ایسا معاشرہ جس میں چیزوں کا علاج اوزاروں کی مدد سے نکالا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک کار خراب ہو جائے تو اس کو مکینک کی ضرورت پڑتی ہے۔ تکنیکی توجیہہ کی ایک لمبی تاریخ ہے۔ انیسویں صدی کے اوائل میں میکس ویبر نے یہ دلیل پیش کی کہ سیاروں کی حرکت کی طرح سماجی رویہ بھی ایک قابل پیمائش عنصر ہے۔ جس سے متعلق پیش گوئی کی جا سکتی ہے۔ تکنیکی توجیہہ ایسے عوامل کا پتہ لگا سکتی ہے جس کو بعد ازاں موثر اور قابل بھروسہ طریقہ کار سے تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کار مکینک کو معلوم پڑ جاتا ہے کہ کار میں کیا مسئلہ ہے اور اس کو کس طرح دور کرنا ہے۔ ویبر کے مطابق تکنیکی توجیہہ کا یہ عمل بیوروکریسی میں رائج العمل ہے۔ تاہم ناقدین سمجھتے ہیں کہ اس کی وجہ سے مشکلات پیدا ہو سکتی ہیں۔ جیسے کار مکینک کار کو ٹھیک تو کر دے گا مگر ہو سکتا ہے کہ اس کے بعد کار کا ملک اس کار کو پہلے کی طرح استعمال نہ کر سکے۔ مکینک ایک فیملی کار کو ریسنگ کار بنا سکتا ہے۔ یوں کار وہ مقصد پورا نہیں کر سکتی جس کیلئے اس کا مالک اس کو استعمال کرنا چاہتا ہے۔ جیمز سکاٹ نے ایسے کئی منصوبوں کی مثالیں دی ہیں جن کو معاشرے میں بہتری لانے کی غرض سے شروع کیا گیا تھا مگر وہ اس سماج کیلئے تباہ کن ثابت ہوئے۔ اس کو مزید سمجھنے کیلئے فرض کیجئے کہ انسانی معاشرہ ایک حساس کمپیوٹر ہے۔ جو چل نہیں سکتا یا کسی ایسے ذریعہ سے معلومات یا ہدایات حاصل نہیں کر سکتا جس کے بارے میں ہمیں علم نہیں ہے۔ ایسا کچھ جب بھی ہوتا ہے ہم میں سے اکثر لوگ مکمل طور پر پریشانی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس صورتحال کو سیاست سے تشبیہ دی جائے تو ہماری طرح کے عام لوگ خود کو بے بس محسوس کرتے ہیں۔ دی اکانومسٹ میں چھپنے والے ایک مضمون میں عوام کو کچھ ایسی ہی صورتحال دکھائی گئی ہے۔ 'جب ہر شعبے کو ماہرین چلا رہے ہوں تو اس بات کی توقع نہیں رکھی جا سکتی کہ پالیسی سے جڑے معاملات عوام یعنی ناتجربہ کاروں کے ہاتھ میں دیئے جائیں گے۔'

اداروں کا نظام اپنے ساتھ ایک خاص ماحول لے کر آتا ہے۔ جب ماہرین مختلف مسائل کا حل نکال رہے ہوتے ہیں تو ان کیلئے عوام محض اشیاء بن کر رہ جاتے ہیں۔ ڈاکٹرز کے پاس مریض ہوتے ہیں، وکلاء کے پاس سائلین ہوتے ہیں اور صحافیوں کے پاس قارئین ہوتے ہیں۔ یہ ماہرین اس عوام یعنی اشیاء کو عام طور پر بے بس تصور کرتے ہیں جو کچھ دے نہیں سکتے بلکہ انہیں صرف کچھ دیا ہی جا سکتا ہے۔ یہ سب جمہوری نظام اور اس کی اقدار کے خلاف نظر آتا ہے جہاں عوام طاقتور ہوتے ہیں اور تبدیلی لانے کا ذریعہ بنتے ہیں۔

ایسے ماہرانہ ماحول اور جمہوری نظام کے مابین ایسے ہی کئی جھگڑے موجود ہیں۔ انہی میں سے ایک کا تذکرہ ووڈرو ولسن جو کہ انتظامی امور پر ریسرچ کرتے ہیں، نے بھی کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ 'بیوروکریسی کا نظام صرف اس جگہ ہی کام کر سکتا ہے جہاں تمام تر معاملات کو عوام کی عمومی سیاسی زندگی سے نکال دیا جائے۔ بیوروکریسی میں شامل ایک ایک چیز کا وجود اسی نظریے سے جڑا ہوا ہے۔'

مارتھا ڈرتھک نے اس ضمن میں پائے جانے والے ایک اور اختلاف کی نشاندہی کی ہے۔ اس فرق کو ہم 'ترجیحات' کے فرق سے منسلک کر سکتے ہیں۔ انہوں نے اس کا مشاہدہ میسا چوسٹس کے فلاحی نظام پر تحقیق کے دوران کیا۔ وہ کہتی ہیں کہ نظام ابتداء میں بہترین اور عوام کے مابین موجود تفریق کے معاملے پر انتہائی حساس تھا مگر پھر اس کو ماہرین کے نظام سے تبدیل کر دیا گیا۔ جہاں ترجیحات مختلف تھیں۔ پرانا نظام کسی شخص کے مخصوص حالات کے پیش نظر اس کے ساتھ مناسب سلوک کرتا تھا۔ مقامی نمائندے لوگوں کو بخوبی جانتے تھے اور یوں انہیں انفرادی طور پر سہولیات ملتی تھیں۔ اس کے برعکس ماہرین نے سب ہی لوگوں کو یکساں سلوک کا حقدار قرار دیا کیونکہ اس کے مطابق پرانا نظام کچھ لوگوں کی حمایت کرتا تھا۔ یوں اس نئے نظام کے تحت ہر ایک کے ساتھ ایک ہی جیسا سلوک کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ قدیم فلاحی نظام اور جدید نظام، دونوں کے ہی فوائد اور نقصانات تھے۔ قدیم نظام میں بدعنوانی کی جا سکتی تھی۔ یوں یہ نظام بدانتظامی کا شکار ہو سکتا تھا۔ دوسری جانب نیا نظام لوگوں کے مابین موجود فرق کو نہیں سمجھتا تھا۔ ان کے حالات کا فرق نہیں سمجھ سکتا تھا۔ اس کے علاوہ یہ نظام قوانین کے شکنجے میں پھنسا ہوا تھا جو عوام کیلئے سمجھنا مشکل تھا۔

اداروں کا قانونی استحقاق بحال کرنے کی کوشش

آج ہم ماہرین کے تیار کردہ نظام میں زندہ ہیں اور ہماری ترقی کا سبب بھی یہی نظام بنا ہے۔ مگر اس کے باوجود اس نظام اور جمہوری اقدار کے مابین اختلاف موجود ہے۔ سرکاری ادارے اور ماہرین جو کہ عوامی اعتماد کے بارے میں اچھی طرح سے جانتے ہیں، اپنا وقار بحال کرنے کی کوشش میں ہیں۔ اور اپنا قانونی استحقاق واپس حاصل کر کے عوام کا اعتماد دوبارہ سے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ادارے اور ماہرین اگرچہ زندگی کے مختلف شعبہ ہائے جات سے متعلق ہیں مگر ان کی طرف سے اس ضمن میں کی جانے والی کوششیں تقریباً ایک جیسی ہی ہیں۔

ان میں سے سب سے زیادہ کی جانے والی کوشش اس بات کا وعدہ کرنا ہے کہ عوام کے ساتھ بہترین ماہرانہ معیار کے مطابق سلوک کیا جائے گا۔ اس سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ شاید عوام کو ایک بار پھر اداروں پر ویسا ہی اعتماد ہو جائے جیسا پہلے کبھی تھا۔ کچھ اداروں کے اپنے کام کو مزید شفاف بنا کر عوامی اعتماد بحال کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے علاوہ شہریوں کی شمولیت کے پروگرام شروع کرنے کی طرف توجہ دی جا رہی ہے۔ تقریباً ہر جگہ ہی عوامی اجتماعات اور سرعام شنوائی کے واقعات رونما ہو رہے ہیں۔ مزید برآں سماجی بہتری کے عوامی منصوبے بھی

شروع کرنے کی حوصلہ افزائی بھی کی جارہی ہے۔

احتساب کی کوشش: کیا اس کا فائدہ بھی ہو رہا ہے؟

سرکاری اور اعلیٰ سماجی اداروں کے لئے یہ ثابت کرنا انتہائی آسان امر ہے کہ وہ عوام کے ساتھ مکمل تعاون کرتے ہیں اور اس ضمن میں کی جانے والی الزام تراشی بے بنیاد ہے۔ وہ اس کو ثابت کرنے کیلئے مخصوص اعداد وشمار پیش کر سکتے ہیں۔ جس کی مدد سے یہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ ان کی طرف سے کئے جانے والے قدامات کے نتائج حوصلہ افزاء ہیں۔ اس سب کا مقصد ان اداروں کے قابل احتساب ہونے کا تاثر دینا بھی ہوتا ہے۔ یہ اعداد وشمار کچھ پیمانوں کی بنیاد پر تیار کئے گئے ہوتے ہیں جیسا کہ سکول میں لئے گئے کسی امتحان میں حاصل کردہ نمبر۔

بظاہر تمام احتسابی منصوبوں کا مقصد عوام کا اعتماد بحال کرنا ہوتا ہے مگر اس کے علاقہ کچھ اور مفادات بھی حاصل کئے جارہے ہوتے ہیں۔ یہ منصوبے اداروں اور ان کے اعلیٰ حکام کے کام پر ہونے والی تنقید کو روکنے کا باعث بھی بنتے ہیں۔ یہ ردعمل توقع کے مطابق ضرور ہے مگر اس کی وجہ سے عوام کا اداروں میں موجود اعتماد کسی صورت بحال نہیں ہوسکتا۔

> **انتظامی معاملات پر تحقیق کرنے والے ایک معتبر ریسرچر کسٹوفر پولٹ دلیل دیتے ہیں کہ 'یہ مفروضہ کہ کارکردگی کا جائزہ دراصل عوامی احتساب کا ذریعہ ہوتا ہے، کسی ثبوت کے بغیر ہی مانا جا رہا ہے۔ اس بات کے بہت ہی معمولی ثبوت موجود ہیں کہ کارکردگی کا اظہار کرنے والے نکات کسی طرح بھی قانون بنانے والوں یا عوام کیلئے کسی صورت بھی فائدہ مند ہیں۔ یہ صرف وزراء اور مقامی مینیجرز کے خلاف ہی نظر آتے ہیں۔'**

کسی ادارے کی کارکردگی جانچنے کا معیار کیا ہونا چاہئے؟ اس معاملے پر عوام اور اداروں میں شدید اختلافات پائے جاتے ہیں۔ یہاں تک دونوں کیلئے احتساب کے معنی بھی الگ ہیں۔ اداروں کے سربراہوں کے ذہن میں صرف اعداد وشمار اور معلومات ہوتیں ہیں جبکہ عوام ان کی کارکردگی کو اپنے ساتھ موجود تعلق سے جانچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس ضمن میں سکولوں، اور بنیادی سرکاری وسماجی اداروں کے ساتھ تعلق زیادہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ جہاں تک سکولوں کا تعلق ہے تو ان سے متعلق امریکی عوام کا رویہ انتہائی ناقدانہ ہے۔ یہاں تک ان میں یہ سوچ بھی پائی جاتی ہے کہ سکول بطور اپنی ذمہ داری پوری کرنے میں ناکام ہو رہے ہیں۔ (جب سینڈی نے بھی اس صورتحال کا سامنا کیا تو اس نے اپنے علاقے میں موجود سکولوں کی حالت بہتر کرنے کا سوچا)۔ عوام اور سکولوں

کے مابین پایا جانے والا تعلق کسی صورت بھی بہتر یا احتسابی نوعیت کا نہیں ہے۔

دوسری طرف یہ عین ممکن ہے کہ سکولوں میں کام کرنے والے اساتذہ اور وہاں کی انتظامیہ خود کو احتساب کے نمونے تصور کرتے ہوں۔ وہ یہ ثابت کرنے کیلئے لمبے چوڑے اعداد و شمار پیش کر سکتے ہیں جنہیں وہ شائع بھی کرتے رہتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ کارکردگی جانچنے کا یہ پیمانہ عوامی توقعات اور مطالبے کے مطابق ہے۔ شہری امتحانات میں آنے والے نمبروں سے متعلق اعداد و شمار کی تعریف تو کرتے ہیں مگر وہ اس سے یہ نتیجہ اخز نہیں کرتے کہ سکول اپنی ذمہ داریاں اچھی طرح پوری کر رہے ہیں۔ وہ یہ ماننے کو تیار نہیں ہیں کہ یہ عوامی ادارے وہی کام کر رہے ہیں جو کرنے کی توقع وہ ان سے کرتے ہیں۔ جہاں لوگ اپنے بچوں کو امتحانات میں اچھے نمبر لیتے دیکھنا چاہتے ہیں وہیں وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ سکولوں کی کارکردگی صرف ایک پیمانہ ہے۔

لوگ یہ بھی چاہتے ہیں کہ ان کے بچوں کے مستقبل کو لے کر نہ صرف سرکاری اداروں بلکہ ان کے معاشرے کا بھی احتساب ہونا چاہئے۔ یہ لوگ سوچتے ہیں کہ موجودہ صورتحال کا ذمہ دار کون ہے؟ وہ یہ بھی خیال کرتے ہیں کہ اس سوال کے جواب کا فیصلہ عوام کی طرف سے کیا جانا چاہئے۔ کیونکہ جب کوئی ادارہ احتساب کی بات کرتا ہے تو یہ عام طور پر عوام کے خیالات سے مختلف ہوتی ہے۔

اس احتسابی عمل کا آغاز مالی تعاون کرنے والے اداروں اور غیر سرکاری سماجی تنظیموں میں بھی کیا گیا ہے۔ فنڈنگ کرنے والے اداروں کے اس اقدام کا مقصد شاید کسی ممکنہ حکومتی رخنہ سازی سے بچنا ہو۔ ایسے ادارے اپنے آپ کو بظاہر اس وقت احتساب کیلئے پیش کرتے ہیں جب وہ یہ جانچنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کی طرف سے لگائے گئے پیسے کا کیا فائدہ ہوا؟ وہ اس کیلئے قابل پیمائش نتائج کا استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح کے کچھ اعداد و شمار این جی اوز کی طرف سے بھی تیار کئے جاتے ہیں تاکہ انہیں مزید فنڈز مل سکیں۔

قابل پیمائش نتائج پر انحصار کی وجہ سے سماجی ترقی کے کاموں میں بھی رکاوٹ پیش آسکتی ہے کیونکہ سماجی ترقی کو ہر دفعہ ماپا نہیں جا سکتا۔ لوگوں کی بڑھتی ہوئی استعداد کار تو کچھ دیگر صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود سماجی تنظیموں کو اپنے نتائج ثابت کرنے کیلئے کچھ قابل پیمائش چیزیں چاہئے ہوتی ہیں۔ دوسری جانب مالی امداد لینے والے ادارے اکثر یہ شکایت کرتے ہیں کہ یہ پیمانے اکثر غیر متعلقہ ہوتے ہیں اور ان کی وجہ سے عوامی منصوبوں کی درست سمت قائم نہیں رہتی۔ یوں ان کی توجہ اہمیت کے حامل کاموں کی طرف نہیں رہتی۔ ان اداروں کا کہنا ہے کہ انہیں مالی تعاون حاصل کرنے کیلئے ایسے کام تو کرنے ہی پڑتے ہیں۔

ایسا کیوں ہے کہ قابل پیمائش پیمانے اکثر سماجی استعداد کاری کے خلاف ہی ہوتے ہیں؟ دراصل یہ ثابت کرنا ایک مشکل امر ہے کہ معاشرے میں نظر آنے والی تبدیلی دراصل ایک خاص فنڈ کی بدولت ہی واقع ہوئی

ہے۔ ڈیوڈ ڈالیر مین جو کہ پہلے ورلڈ بینک سے منسلک رہے ہیں، نے اس مشکل پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ 'براہ راست معاونت کرنے والے ادارے اور سماجی تنظیموں کو خود جس قدر زیادہ مالی تعاون کی ضرورت ہوتی ہے وہ اسی قدر حقائق کو بھی زیادہ توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہیں تا کہ ثابت کیا جا سکے کہ دیئے جانے والے پیسے سے مثبت اثرات پڑ رہے ہیں۔ اس کی بجائے درحقیقت ایسے ادارے معاشروں میں خود انحصاری کی بجائے کسی کی مدد پر جینے کی عادت ڈالتے ہیں۔' کیٹرنگ فاؤنڈیشن اور ہارووڈ انسٹی ٹیوٹ فار پبلک انوویشن کے تعاون سے ہونے والی تحقیق میں بھی یہ بات سامنے آئی کہ فنڈنگ کی وجہ سے حاصل کردہ نتائج کو قابل پیائش پیمانوں کے ساتھ پیش کرنے کی وجہ سے مالی تعاون کرنے والے اداروں کی توجہ کئی دوسرے امور کی طرف جاتی جا رہی ہے۔ وہ ماہرین کی رائے کہ زیادہ قریب تر ہونے کی کوشش کرتے ہیں اور نتیجتاً وہ عوامی توقعات سے دور ہوتے جاتے ہیں۔ معاشروں کیلئے سب سے زیادہ پریشانی کی بات یہ ہے کہ اس احتساب کے دوران عوام کو ان بیرونی عناصر پر انحصار کرنا پڑتا ہے جو ان کی اجتماعیت اور بطور معاشرہ سیکھے گئے اسباق کو نظر انداز کرتے ہیں۔ میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ ایسے معاشرے جو اپنی اجتماعی کوششوں سے سبق حاصل کرتے ہیں وہ ڈوب کر ابھرنے اور اپنے مسائل خود سے حل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ دوسری طرف احتساب کرنے والے اداروں کے مطابق ان عناصر کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی اور وہ عوام کی طرف سے سیکھنے کے عمل کو مختلف انداز سے دیکھتے ہیں۔

اس احتسابی عمل کی وجہ سے صرف مالی امداد وصول کرنے والے لوگ ہی متاثر نہیں ہوتے بلکہ اس سے فلاحی منصوبوں کے ایک بڑے مقصد کو بھی نقصان پہنچتا ہے جس کا تعلق معاشرے میں جدت پسندی کو رجحان دینے سے ہوتا ہے۔ اس عمل کے فروغ کیلئے تجربات کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ تجربات ان بے ترتیب چیزوں پر کئے جاتے ہیں جن سے مستقبل قریب میں مثبت نتائج کی توقع ہوتی ہے۔ کئی کامیاب نظر آنے والے تجربات اکثر ناکام بھی ہو جاتے ہیں۔ مگر ان کا تذکرہ نہیں کیا جاتا۔ اس کے بارے میں ایک دفعہ ایک شخص نے بتایا جو ان معاملات کی نگرانی کا ذمہ دار تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ 'مجھے ناکام ہونے کی اجازت ہی نہیں ہے۔'

اختراعی تجربات شاید اپنے متوقع نتائج پیش کرنے میں مکمل طور پر ناکام ہو جائیں۔ یوں سماجی تجربات سے ناکامی کی صورت میں بھی کافی کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر وہ معاشرہ اپنے طے شدہ مقاصد کے بارے میں نظر ثانی کر سکتا ہے۔ مزید برآں نئے نئے تجربات کرنے والے معاشرے ایک مخصوص یا طے شدہ راستے پر عمل کرنے کی بجائے یہ سفر پیدل طے کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔

بلاشبہ کسی منصوبے کا حصہ بننے والے لوگ اس کے مقاصد میں شفافیت کے خواہاں ہوتے ہیں۔ وہ یہ جاننا چاہتے ہوتے ہیں کہ ان کی طرف سے کی جانے والی کوششوں کے کیا نتائج نکلے۔ لیکن باہر سے آ کر مالی تعاون کرنے والے اداروں کے غیر ضروری پیمانوں کے ذریعے کارکردگی جانچنے کے عمل سے بیزار عوام اب ان کے

منصوبوں میں بھی شامل ہونے سے کتراتے ہیں۔ وہ ان کے کاموں محض کھیل سے تشبیہ دیتے ہیں۔ اس کی وجہ سے نا صرف معاشرے میں جدت پسندی کے رجحان کو پروان پڑھانے میں مشکلات پیش آتی ہیں بلکہ یہ صورتحال فنڈنگ دینے والے ان لوگوں کیلئے بھی پریشانی کا باعث ہے جو تخلیقی صلاحیتوں کی قدر کرتے ہیں۔ یہ لوگ اب سماجی کاموں سے غیر متعلقہ ہوتے جا رہے ہیں۔

ایک شیطانی چکر

بدترین صورتحال میں بظاہر احتساب نظر آنے والا یہ نظام عوام کے عدم اعتماد میں اضافے کا باعث بھی بن سکتا ہے۔ یہ طریقہ کار نہ صرف اپنے مقصد میں نا کام ہوسکتا ہے بلکہ اداروں میں عوامی اعتماد کی بحالی کی بجائے اداروں اور عوام کے مابین خلا کو مزید گہرا کر دیتا ہے۔

برائن کوک کی ریسرچ میں یہ بات سامنے آئی کہ 'ایک بڑھتا ہوا شیطانی چکر نمودار ہوتا جا رہا ہے جس میں عوامی کنٹرول اور احتساب سے متعلق پریشانی کے سبب مزید پیچیدہ طریقہ کار وضع کر دیئے گئے ہیں۔ جس میں عوام اور بیوکریسی اداروں کے درمیان کھڑی دیوار مزید بلند ہوتی جا رہی ہے۔ ایسی عوام جن کی خدمت کرنا ہی عوامی اداروں کا اصل مقصد ہے۔ اسی فاصلے کے سبب احتساب اور عوامی کنٹرول سے متعلق مزید خدشات بھی پیدا ہو رہے ہیں۔ کیونکہ بظاہر عوامی اختیار کے سامنے ایک اور دیوار کھڑی کر دی گئی ہے۔' کوک کا خیال ہے کہ یہ نتائج احتسابی عمل کے بظاہر نظر آنے والے مقاصد سے یکسر مختلف ہیں۔

مایوسی میں اضافہ

اس عمل کے تمام تر نقصانات اور غیر متوقع نتائج کے باوجود ہم اپنے تمام اداروں میں احتسابی عمل کو پروان چڑھتے دیکھنا چاہتے ہیں۔ جیسا کہ ڈیموکریٹک پروفیشنلزم کتاب کے مصنف البرٹ ڈزور کا کہنا ہے کہ 'احتسابی عمل کی اپنی ایک حیثیت ہے۔ ہم دیکھنا چاہتے ہوتے ہیں کہ ہمارے سکول، ہسپتال اور دیگر ادارے وہ کام کس حد تک سرانجام دے رہے ہیں جو کام عوام انہیں کرتے ہوئے دیکھنا چاہتے ہیں۔' تاہم البرٹ کا یہ خدشہ ہے کہ ایسا کچھ درحقیقت ہو نہیں رہا۔ ہمارے ادارے ماہرین کی آراء پر عمل کر کے اور مزید تکنیکی الجھنوں کو پیدا کر کے الٹی سمت میں جا رہے ہیں۔ حالانکہ یہ ادارے تو دراصل اپنی ساکھ ہی بحال کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ انہوں نے اس صورتحال کو 'سپر پروفیشنلزم' کا نام دیا ہے۔

اگر جمہوری روایات کی روشنی میں ادارے پیشہ ورانہ بہتری حاصل کرنا چاہیں تو یہ عوام کے تحفظات دور کرنے سے ممکن ہے۔ امریکیوں کو احتسابی عمل ہوتا دیکھنے کی خوشی سے زیادہ اس عمل کی مکمل غیر موجودگی کا دکھ ہے۔ عوام کو ان افسران پر شدید غصہ آتا ہے جو خود غرضی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور اپنے بنیادی فرائض پورے نہیں کرتے۔ شہریوں کا ایک گروہ یہ بھی سمجھتا ہے کہ یہ افسران صرف اپنے ادارے اور اپنے پیشے کو بچانے کیلئے کام کر

رہے ہیں۔ بعض افسران تو سنجیدہ نوعیت کی غفلت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ جو معاشرتی اقدار کے بھی منافی ہوتی ہے۔ اس کی وجہ سے یہ تاثر مزید گہرا ہوتا ہے کہ اداروں میں کام کرنے والے اہلکار غیر ذمہ دار ہیں۔

یہ معاملہ چاہے سرکاری ملازمین کا ہو یا کاروباری طبقے کا یا بحث کا موضوع اساتذہ ہوں، ہر ایک کے بارے میں عوام کی رائے یہی ہے۔ یوں جس بھی میدان کو رخ کیا جائے شہری اور افسران ایک صفحے پر نظر نہیں آتے۔

افسران اکثر اوقات احتسابی عمل کے عوامی مطالبے کو کچھ غلط سمجھ جاتے ہیں۔ کچھ ایسا جو کبھی بھی عوام کی خواہش نہیں ہوتی۔ عوام کو معلومات چاہیئے ہوتی ہیں مگر وہ افسران کی طرف سے پیش کئے جانے والے اعداد و شمار سے بھی مطمئن ہوتے نظر نہیں آتے۔ اس سے انہیں لگتا ہے کہ افسران انہیں گنتی کے بے ہنگم چکر میں الجھا کر استعمال کر رہے ہیں۔

افسران کی طرف سے دھوکہ دیئے جانے کی بات کو لے کر امریکیوں میں شدید مایوسی پائی جاتی ہے۔ اینڈریو گلیگن نے برطانیہ کے ٹیلی گراف اخبار میں لکھے گئے اپنے ایک مضمون میں بھی کچھ ایسی ہی بات چیت کی ہے۔ انہوں نے اس عمل کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا جس میں افسران حکام بالا کی مرضی کے نتائج دکھانے کیلئے عوامی مشاورت کے فرضی منصوبے چلاتے ہیں۔ اینڈریو کا خیال ہے کہ یہ فرضی مشاورتی پروگرام دراصل افسران کو عوام سے بچانے کی ایک کوشش ہے۔ انہوں نے ایسے فرضی اجتماعات کو دھوکہ دہی قرار دیا۔ انہوں نے کہا کہ سرکاری اداروں اور ان کے ماتحت اہلکاروں کی جانب سے شروع کئے جانے والے یہ منصوبے مایوسی کا مظہر ہیں۔ جو ایک جعلی استعداد کار ظاہر کر کے اپنی قانونی ساکھ بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کے مطابق اس طرح کے مشاورتی پروگرام آج کی بیوروکریسی میں کسی نشے کی طرح پھیل چکے ہیں۔ یہ نشہ امریکہ میں کس حد پھیل چکا ہے، اس کا اندازہ لگانا تو مشکل ہے مگر اس دھوکہ دہی پر احتجاج امریکہ میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔

ذمہ داری کا مظاہرہ

میں نے سکولوں سے متعلق عوامی رائے پر جو بات کی اسی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے میں کہنا چاہتا ہوں کہ احتساب مکمل طور پر ایک دفتری اصطلاح ہے۔ لوگ اس کی بجائے ذمہ داری پر بات کرنا چاہتے ہیں۔ جب عوام احتساب کی بات کرتے ہیں تو اس کا مطلب بھی یہی ہوتا ہے کہ کیا کوئی اپنی ذمہ دوری پوری کر رہا ہے؟ لیکن احتساب درحقیقت صرف حکام کو معلومات اور آگہی دینے کا عمل ہے۔ لیکن شہریوں کیلئے یہ باہمی تعلقات کی نوعیت سے متعلق ایک عنصر ہے۔ لوگ افسران کے ساتھ کھلا، خیر خواہی اور باہمی شمولیت کا تعلق قائم کرنا چاہتے ہیں۔ جس میں انہیں احساس ملے کہ ان پاس کے کون کون سی طاقت ہے۔

اداروں کے ساتھ ایسا تعلق رکھنے والے لوگ انتہائی سودمند ثابت ہوتے ہیں۔ جان گویٹنا اور گریگوری بیرٹ کا کہنا ہے کہ باہمی فائدے پر مبنی تعلقات کی وجہ سے عوام کے علم میں اضافہ ہوتا ہے اور ان کی سیاسی افادیت بڑھ جاتی ہے۔ یوں ادارے بھی زیادہ ذمہ دار اور بھرپور ردعمل دیتے نظر آتے ہیں۔

ایک اور موقع: بہتر ترتیب

ایسا کیا چاہئے جس سے عوام کا اعتماد بحال ہو اور وہ خود کو زیادہ خودمختار تصور کرنے لگیں؟ میرے خیال میں آدھے سے زیادہ سوال کا جواب عوام اور اداروں کی طرف سے سرانجام دیئے جانے والے کاموں کی بہتر ترتیب میں ہے۔ ایک ایسی ترتیب جس میں شہریوں اور اداروں کا کام باہم مل کر مکمل ہو جائے۔ ان کے کئے گئے کام ایک دوسرے کیلئے متبادل بن جائیں۔ اس پر زیادہ بات اگلے باب میں کریں گے۔ تاہم یہاں یہ کہنا ضرور مناسب ہوگا کہ ادارے عوام کی طرف سے کئے جانے والے کاموں سے فائدہ اٹھا کر مزید موثر ہو جاتے ہیں۔ یوں ایسے کاموں میں فائدہ نظر آنے کی وجہ سے وہ عوامی تحفظات کو لے کر بھی ذمہ داری کا مظاہرہ کرنے لگتے ہیں۔ ایسے تعلق کو سمبی اوسس کہا جا سکتا ہے۔ جو کہ خالصتاً بائیولوجی کی اصطلاح ہے جس میں دو جانداروں کے مابین ایک ایسا تعلق پیدا ہو جاتا ہے جس سے دونوں کو ہی فائدہ پہنچتا ہے۔ شہد کی مکھیوں اور پھولوں میں یہی تعلق پایا جاتا ہے۔ اسی طرح کی بات میں نے کتاب کے آغاز میں مربع شکل اور پانی کی بوندوں کی تشبیہات استعمال کر کے بھی کہی تھی۔ وہاں بھی میری مراد یہی تھی کہ عوام اور اداروں کے کاموں کی بہتر ترتیب اور تعلق سے دونوں کے درمیان تعاون کی فضا قائم ہو سکتی ہے۔ ایسے ماحول میں ادارے عوام کی طرف سے کئے جانے والے ان کاموں سے بھرپور فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو صرف عام لوگ ہی کر سکتے ہیں۔ اس کے بدلے میں عوام کو بھی اداروں سے وابستہ خواہشات پوری ہوتی نظر آتی ہیں۔

بہتر باہمی تعلق کے ثمرات

عوام کے ساتھ بہتر روابط کی عدم موجودگی میں ادارے بھی باہمی طور پر مل کر کوئی کام کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ ادارے عوام کی مدد کرنا چاہتے ہوتے ہیں جبکہ عوام اپنا مستقبل ترتیب دینے میں کچھ زیادہ دخل دینے کی خواہش رکھتے ہیں۔ یوں عوام کی مدد کے بغیر اگر ادارے ان کی معاونت کرنے لگیں تو شاید وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ الباما ریاست کے ایک ساحلی علاقے بیولے باترے میں بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ یہاں لوگ اٹھارہویں صدی کے فرانسیسی نوآبادیاتی نظام کے وقت سے رہائش پذیر تھے۔ یہاں رہنے والوں کے آباؤاجداد میں فرانسیسی، افریقی نسلوں کے علاوہ جنوبی ایشیائی نسل کے لوگ بھی شامل تھے جو یہاں سمندری جانداروں کا شکار کرنے کی غرض سے آباد ہوئے تھے۔ ان مختلف گروہوں کے مابین کچھ اختلافات پائے جاتے تھے تاہم ان کے درمیان کوئی سنجیدہ نوعیت کی لڑائی نہیں تھی۔ پھر سال 2005 میں آنے والے قطرینہ نامی سمندری طوفان کی وجہ سے

یہ کمیونٹی تقریباً مکمل تباہ ہوکر رہ گئی۔

اس طوفان کی وجہ سے کئی گھر تباہ ہو گئے۔اس کی وجہ سے ماہی گیری کا کاروبار بھی تباہ ہو گیا کیونکہ کئی کشتیاں بھی متاثر ہوئی تھیں۔سمندر سے باہر نکل آنے والی ان کشتیوں کو واپس سمندر میں لے جانے کیلئے سخت محنت کرنا پڑی۔اسی دوران ایک کاروباری گروہ نے اس علاقے میں زمین کا ایک قطعہ خریدنے کی کوشش کی تاکہ وہاں ایک سیاحتی مرکز قائم کرسکیں۔بعض شہریوں نے اس کی وجہ سے خیال کیا کہ اب علاقے میں خوشحالی ہو جائے گی۔مگر باقی لوگوں کا خیال تھا کہ اس کی وجہ کاروباری لوگ اس علاقے میں زیادہ اثر ورسوخ حاصل کرلیں گے اور نتیجتاً علاقے کے فیصلوں میں عوام کا عمل دخل کم ہوکر رہ جائیگا۔بالکل اسی طرح جیسے لوگ ڈزنی لینڈ کی سیر کرنے کوتو جاتے ہیں مگر وہاں رہائش اختیار کرنا پسند نہیں کرتے۔معاشرے کے تمام ہی لوگ علاقے کی بہتری چاہتے تھے، عمارتیں دوبارہ تعمیر کرنا چاہتے تھے۔اور کچھ لوگ اس کیلئے باہمی تعاون کرنے پر بھی تیار تھے۔

اس علاقے کے قریب واقع ادارے، گرجا گھر اور فلاحی تنظیمیں ان لوگوں کی مدد کرنے کو بیتاب تھیں۔ اوران کی مدد کوتعریف کی نظروں سے بھی دیکھا جارہا تھا۔تاہم قرضے اور مالی مدد فراہم کرنے والی تنظیموں میں سے کسی نے بھی عوام سے یہ بنیادی سوال نہیں پوچھا کہ ہم آپس میں مل کر کس طرح عوام کی مرضی کا معاشرہ قائم کر سکتے ہیں؟ یہ ایک اہم ترین سوال تھا۔چاہے معاشرہ کسی بھی طرح کے خطرے سے دوچار ہو، میں اس سوال کو سب سے زیادہ اہمیت دینے کا خواہاں ہوں۔

اس کہانی کو میں کچھ ایسے کہوں گا۔سب کچھ کیا جارہا تھا مگر اس کا فائدہ کچھ بھی نہیں تھا۔تقریباً تمام ہی ادارے عوام کی طرف سے کئے جانے والے بنیادی سوالوں کے جوابات دینے کیلئے درست طور پر تیار نہ تھے۔ان اداروں کے پاس مالی وسائل موجود تھے مگر وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ علاقے کے لوگ آپس میں مل جل کر کیسے اس صورتحال سے نمٹ سکتے ہیں۔وہ نہیں سمجھتے تھے کہ وہ کام آخر کون کرے گا جو کام عوام کی طرف سے کئے جانے تھے؟ تمام ہی ادارے اس سوال کے بارے میں سوچ رہے تھے کہ وہ اس کمیونٹی کیلئے کیا کر سکتے ہیں؟ یہ ایک قلیل المدتی حل تھا۔جبکہ اداروں کو طویل المدتی حل کے بارے میں سوچنا چاہئے تھا۔یوں اداروں اور عوام کے مابین ایک بہتر تعلق اور کاموں کی خاص ترتیب طے پا جانے کی وجہ سے یہ ممکن تھا کہ یہ ادارے عوام کو ان کے اپنے کام کرنے میں مدد فراہم کرتے اور یوں عوام کی مرضی کے مطابق مسائل کا حل نکل آتا۔

جمہوری روایات کی معاونت

اداروں اور عوام کے مابین معاملات کی بہتر ترتیب کوئی مشکل کام نہیں ہے۔اس کیلئے کسی بڑی اصلاح کے متعارف کروانے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔یا پھر اس کیلئے پہلے سے ہی تھکے ہوئے ماہرین اور ملازمین کو روزانہ کچھ گھنٹے مزید کام کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔بالکل اس کا حل تو انتہائی آسان ہے۔اس کیلئے افسران کو

اپنے وہی کام جو وہ پہلے ہی کرتے ہیں کچھ اس انداز سے کرنا ہوں گے کہ ان کی وجہ سے جمہوری روایات کی معاونت ہو۔

ترتیب کی سیدھ کا یہ معاملہ تھوڑا ٹیڑھا بھی ہے کیونکہ سرکاری افسران اگرچہ خود بھی شہری ہی ہوتے ہیں مگر پھر بھی عوام اور ان کے کام کرنے کے انداز میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ میں نے یہ پہلے بھی سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ آپ کو مسئلے کو خاصیت دینے والی بات تو یاد ہی ہوگی۔ اسی طرح مسائل کو مباحثے کیلئے پیش کرنا اور ان کا حل تلاش کرنا، ہر معاملے میں یہی بات سامنے آتی ہے۔ مگر یہ بات بھی ایک حقیقت ہے کہ جمہوری روایات کو چلانے کیلئے اداروں کی طرف سے ان کی معاونت درکار ہوتی ہے۔ ادارے جیسا کہ سکول، ہسپتال اور غیر منافع بخش سماجی تنظیمیں بھی تو کام کرتے ہیں، سوچ بچار کرتے ہیں اور اپنی غلطیوں سے سیکھتے بھی ہیں۔ یعنی کہ سب کام تو ہو ہی رہے ہیں سب ذرا مختلف انداز میں ہو رہے ہیں۔ معاملات کی بہتر ترتیب اسی فرق کو ختم کرتی ہے۔ اس کو مل جل کر رہائش اختیار کرنے سے بھی تشبیہ دی جاسکتی ہے۔

اگلے مرحلے میں اب میں وہ معاملات زیر بحث لاؤں گا جہاں اداروں اور عوام کے مابین معاملات کی کوئی خاص ترتیب وجود رکھتی ہے اور کوئی تجربہ کرنے کی گنجائش موجود ہے یا پھر ایسے مواقعے جہاں اس بات کا امکان موجود ہے کہ ادارے عوام کے ساتھ بہتر تعلق قائم کرنے کیلئے جمہوری روایات کے کام کرنے کے انداز کو سمجھ سکتے ہیں۔

☆☆☆☆

باب بارہ

معاشرے کی اصلاح کیلئے تجربات اوران کیلئے دستیاب مواقع

بہت سے ادارے پہلے ہی اپنا کام کرنے کے انداز کوشہریوں کی طرف سے اپنائے گئے طریقہ کار کے مطابق ڈھال رہے ہیں۔تاکہ شہریوں کی طرف سے کئے جانے والے کاموں کومفید بنایا جاسکے۔اداروں اورعوام کے مابین عدم تعاون کی موجودہ فضا کی ایک وجہ افسران کے دماغ میں پائی جانے والے یہ سوچ ہے جس میں وہ یہ فیصلہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ شہریوں کوکیا سوچنا چاہئے اورانہیں کام کس طرح سرانجام دینے چاہئیں۔یوں عوام اوراداروں کے مابین سوچ کا یہ فرق ایک بڑا مسئلہ ہے۔میں بات کا آغاز ایسی جگہ پر کئے گئے تجربات سے کرنے جارہاہوں جہاں 'معلومات' کو بنیادی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔جیسا کہ سکول، کالج، یونیورسٹیاں اورمیڈیا کے ادارے۔ان میں سے بیشتر تجربات محض روزمرہ کے معمول میں تبدیلی سے متعلق ہیں۔تاہم ان میں مختلف چیز یہ ہے کہ معاملات عوام کے ہاتھ میں دیئے گئے ہیں۔جن کی بدولت انہیں یہ موقع ملتا ہے کہ وہ عوام اوراداروں کے درمیان موجود فاصلوں کوکم کرسکیں۔

اداروں کوایسے تجربات کرنے کا کیا فائدہ ہوسکتا ہے جن کی وجہ سے زیادہ طاقت عوام کے ہاتھوں میں چلی جائے؟ اگرچہ ان تجربات کے نتیجے میں یہ ادارے مکمل طور پر طاقت سے محروم نہیں ہوجاتے مگر پھر بھی یہ صورتحال ان کے مفاد میں کیسے ہوسکتی ہے؟ اس ضمن میں میرا جواب یہ ہے کہ اداروں کو فائدہ اس صورت میں ہو سکتا ہے جب ان اقدامات کی بدولت عوام متبادل منصوبوں پر کام کرنے لگتے ہیں اور یوں حکومتی منصوبوں کی کامیابی کے امکانات بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

ایسے تجربات جن کا تذکرہ میں ابھی یہاں کرنے جارہاہوں ان میں سے بہت سوں پرابھی کام مکمل نہیں ہوسکا۔مگران کا حوالہ دینے کا مقصد عوام کے ہاتھوں میں موجود طاقت کی اہمیت اوراس کے سبب اداروں کوحاصل ہونے والے فوائد پرروشنی ڈالنا ہے۔ایک ماہر موسمیات کی طرح میں یہاں اس مناسب ماحول کا تذکرہ کروں گا جس کی موجودگی میں کوئی خاص واقعہ رونما ہوسکتا ہے۔یہاں یہ واقعہ عوامی اورسرکاری اقدامات میں مناسب تعلق قائم ہونے کی صورت میں سامنے آسکتا ہے۔یہاں میں صرف ایسے تجربات کا ہی تذکرہ نہیں کروں گا جو پہلے سے کامیاب ہوچکے ہیں بلکہ ان مواقعوں پربھی روشنی ڈالوں گا جہاں ایسے تجربات کی گنجائش موجود ہے۔اس کیلئے ہم صحافت سے آغاز کریں گے۔

صحافت کے میدان میں موجود مواقع

کولےمپیل جو کہ ایک اخبار کے سابق ایڈیٹر ہیں اور بعد میں یونیورسٹی آف نویڈا میں پروفیسر رہے، کا خیال ہے کہ صحافت صرف معلومات کی ترسیل سے کچھ بڑھ کر ہے۔ اس عمل کے ذریعے اخبارات یہ فیصلہ بھی کر رہے ہوتے ہیں کہ آخر عوام کو خود پر حکمرانی کرنے کیلئے تیار کرنے کی غرض سے کس قسم کی معلومات فراہم کی جانی چاہئیں؟ اس معلومات کو حقائق کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔ کولے ابھی اس سوال کے جواب پر غور وحوض ہی کر رہے تھے کہ ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کے علاوہ کچھ اور صحافی بھی اس معاملے پر غور فکر کر رہے تھے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ کیا ہو جب عوام کو محض قارئین سے بڑھ کر تصور کیا جائے؟ اگر قارئین کو شہری سمجھا جانے لگے تو اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ اس عمل کا عوام کی طرف سے سرانجام دیئے جانے والے منصوبوں پر کیا فرق پڑے گا؟

کولے کا یہ سوال کہ عوام حق حکمرانی کو اپنے ہاتھوں میں لینے کیلئے کونسی معلومات کی فراہمی چاہتے ہیں؟ اس وقت اور بھی گہرا ہو جاتا ہے جب اس کو ڈیوس میرٹ کے دلائل کے سیاق وسباق میں دیکھا جائے۔ میرٹ کینسا س میں ایک اخبار کے ایڈیٹر تھے اور ان کا کہنا تھا کہ ہمارے معاشرے میں موجود مسائل اس وقت تک ختم نہیں ہو سکتے جب تک عوام وہ کام سرانجام نہیں دینے لگتے جو انہیں دیگر شہریوں کے ساتھ مل کر سرانجام دینا ہیں۔ ان کا ماننا تھا کہ ہمیں شہریوں کو صرف قارئین کی حیثیت سے نہیں دیکھنا چاہئے بلکہ عوام کو فعال کردار ادا کرنے والے شہریوں کے طور پر لیا جانا چاہئے۔ یوں اس صورتحال میں کولے کے سوال کو کچھ یوں بھی لیا جا سکتا ہے کہ آخر وہ کون سی معلومات ہیں جن کی ترسیل کے نتیجے میں عوام اپنے مسائل سے نمٹنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں؟

جب کولے بطور ایڈیٹر کام کر رہے تھے تو ان کو محسوس ہوا کہ عوام کو صرف حقائق کی فراہمی ہی کافی نہیں ہے۔ انہوں نے یہ جاننے کیلئے کہ شہری آج کل کیا سوچ رہے ہیں؟ اپنے رپورٹرز کو عوام کے گھروں میں بھیجا۔ ان سے کہا کہ وہ اپنے ہمسائیوں کے گھر جائیں اور ان سے تبادلہ خیال کریں۔ یوں ان صحافیوں کے ذریعے عوام کو اپنے مسائل بامعنی الفاظ میں بیان کرنے کا موقع ملا۔ کولے نے رپورٹرز کے ذریعے ملنے والی معلومات کو آنے والے انتخابات کے امیدواروں سے کئے جانے والے سوالنامے تیار کرنے میں استعمال کیا۔ اس تجربے میں یہ بات سامنے آئی کہ شہریوں کی طرف سے بیان کی جانے والی مصیبتوں کے نام ان ناموں سے انتہائی مختلف تھے جو امیدواروں کی جانب سے استعمال کئے جاتے تھے۔

اس تجربے کے بہترین سامنے آنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کولے کی جانب سے عوام کی رائے جاننے کیلئے کسی مخصوص گروپ کا انتخاب نہیں کیا گیا تھا۔ انہوں یہ تجربہ اس مفروضے کی بنیاد پر کیا کہ عوام میں سے کوئی ایک فرد یا کوئی خاص گروہ ساری عوام کی نمائندگی نہیں کر سکتا۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ عوام اپنے رشتہ داروں اور ہمسائیوں سے معمول کی بات چیت کے دوران ان کی رائے بنانے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔

ڈین بینکلو وچ کی باتوں کی روشنی میں اس طرح کے کئی مزید تجربات بھی کئے جا سکتے ہیں۔ ڈین کی باتیں بھی اسی معاملے سے متعلق ہیں جس کو کیٹرنگ فاؤنڈیشن کی جانب سے مسائل کو نام دینا قرار دیا گیا ہے۔ انہوں اظہار رائے کے حق کے نکتے کو استعمال کرتے ہوئے ایسے کئی نکاط کی نشاندہی کی ہے جہاں عوام اور ماہرین کی رائے میں اختلافات پائے جاتے ہیں۔ ان کے پیشہ ورصحافی آزادی اظہار سے مراد اہم ترین امور کے چناؤ کی آزادی لیتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ امریکی آئین میں کی جانے والی پہلی ترمیم کے ذریعے عوام کو ہر وہ بات کہنے کا حق دیا ہے جو کہی جانی چاہئے۔ دوسری جانب جب رائے دہی میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ عوام پہلی ترمیم اور دیگر ترامیم میں فرق کو نہیں جانتے تو شاید یہ ماہرین عوام کو کم عقل یا جاہل تصور کریں۔ ان کا یہ بھی خیال ہوسکتا ہے کہ عوام آزادی اظہار کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ اس عمل کے دوران یہ ماہر صحافی یہ بات بھول جاتے ہیں کہ آخر عوام اس پہلی ترمیم سے کیا مطلب لیتے ہیں؟ ہوسکتا ہے عوام کو اس ترمیم کے بارے میں علم ہو مگر ان کا نکتہ اعتراض صرف معلومات تک رسائی تک ہی محدود ہو۔ عوام کے مطابق امریکی آئین میں کی جانے والی ترمیم انہیں کچھ بھی سننے کا حق دیتی ہے۔ ان کے خیال میں یہ ترمیم انہیں صرف بولنے کا حق ہی نہیں بلکہ کسی بھی قسم کی معلومات تک رسائی کا حق بھی فراہم کرتی ہے۔

کولے جیسے تجربات پر کام کرتے ہوئے صحافیوں کو کچھ نیا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ وہ تو معاملات کو عوامی رنگ میں پیش کرنے کا کام پہلے سے ہی سرانجام دے رہے ہوتے ہیں۔ انہیں صرف مسائل کو ایسے نام دینے کی ضرورت ہے جو ایک خاص سماجی ماحول کے مطابق ہوں۔ لیکن اس سب سے صحافیوں کو ملے گا کیا؟ اگر صحافی مسائل کو وہ نام دینا شروع کردیں جو نام انہیں عوام کی طرف سے دیئے جاتے ہیں تو عوام کو سماجی منصوبوں میں شامل کرنے کے امکانات کہیں بڑھ جاتے ہیں۔ ایسے شہری جو منصوبوں میں فعال کردار ادا کرتے ہیں اخباروں اور صحافتی مواد کے بہتر قاری بنتے ہیں۔

میسوری کے علاقے سپرنگ فیلڈ میں میڈیا کے مواد اور عوامی مسائل میں ہم آہنگی پیدا کرنے کا کامیاب تجربہ کیا گیا۔ یہ تجربہ کم عمر لوگوں سے جڑے جرائم کے معاملے پر کیا گیا۔ اس میں یہ بات بھی سامنے آئی کہ عوام اس طرح کے تجربات کو پسند کرتے ہیں۔ اس تجربے کے دوران ایک مقامی اخبار نے جرائم کا مقابلہ کرنے کیلئے مختلف اقدامات کی ایک طویل فہرست تیار کی۔ اس میں روایتی طریقہ کاروں سے ہٹ کر کئی دیگر طریقہ کار بھی شامل تھے۔ یوں اس مضمون کے چھپنے کی وجہ سے عوام میں مباحثے کی بنیاد پر کوئی حل نکالنے کے عمل کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ اس کے بعد اگلے معاملے کی کوریج کے دوران اخبار نے دوبارہ سے روایتی طریقہ کار اپنایا اور دو یا تین عام حل ہی پیش کئے۔ اس کی وجہ سے مشکل صورتحال مزید مشکل سے دوچار ہوگئی کیونکہ عوام کو دیے گئے آپشنز کی تعداد محدود تھی اور ان پر مباحثہ کرکے عوام فوائد ونقصانات کا بہتر احاطہ نہیں کرپا رہے تھے۔ اس صورتحال میں عوام نے اس اخبار کے

ایڈیٹر سے متعلقہ مواد کی اشاعت کے خلاف شکایت درج کروادی۔اس کی وجہ یہ تھی کہ جب اخبار جانتا ہے کہ اسے کس طرح عوام کی مدد کرنی ہے تو پھر روایتی طریقہ کار واپس کیوں اپنایا گیا تھا؟

دوسری کمیونٹیز میں کئے جانے والے مختلف تجربات میں بھی بات سامنے آئی کہ اخبارات کے مواد کی عوامی مسائل سے زیادہ مناسبت کی وجہ سے معاشروں میں بحث ومباحثے کی حوصلہ افزائی ہوئی۔پینسلوینیا کے ایک کالج کے ایک ایسے گروپ کے ساتھ ڈیلی ٹائمنر نے مل کر کام کیا۔یہ گروپ نیشنل ایشوز فورمز کے معاملے پر کام کرتا تھا۔اس اخبار نے اپنے اداراتی صفحے پر مباحثے کا طریقہ کار شائع کیا اور بعدازاں اس کو فورمز کے دوران استعمال کیا۔اخبار نے ان فورمز کو بعد میں شائع بھی کیا۔دوسری جانب فلیفیلڈ یا میں صحافیوں،مقامی اداروں اور یونیورسٹی آف پینسلوینیا کے درمیان ایک معاہدہ موجود ہے جس کے تحت سنجیدہ مسائل پر عوامی مباحثے کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔مقامی شہروں کے بجٹ میں کمی جیسے معاملات بھی اسی منصوبے کے زیر بحث لائے گئے۔اس منصوبے کا ایک مقصد یہ جاننا بھی تھا کہ عوام دیئے گئے مختلف آپشنز کا کس طرح جائزہ لیتے ہیں اور وہ بجٹ سے جڑے معاملات میں کس طرح مختلف مشکل فیصلے کرتے ہیں؟

میرا یہ خیال ہے کہ عوامی مسائل اور میڈیا مواد میں زیادہ مطابقت پیدا کرنے کے مزید تجربات آن لائن میڈیا کے میدان میں کئے جاسکتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ آن لائن میڈیا میں کام کرنے والے ماہرین کو الگ دیکھنے کیلئے بعض اوقات اس کو شہری صحافت کا نام بھی دیا جاسکتا ہے۔یہاں وہ لوگ بھی صحافتی عمل کا حصہ بنتے ہیں جنہیں پہلے قارئین یا ناظرین کہا جاتا تھا۔یہ لوگ اب دوسرے لوگوں تک بڑے موثر انداز میں پہنچ رہے ہیں۔لیکن اس میدان میں معاملات کے مابین مطابقت کو مزید بڑھانے کیلئے ضروری ہے کہ بین الافراد رابطے کو بڑھایا جائے تاکہ لوگ ایک دوسرے کے تجربات سے فائدہ اٹھاسکیں۔اسی طرح ہی ایک ایسے معاشرے کی تشکیل ممکن ہے جس کی بنیاد عملی دانائی پر رکھی ہو اور جہاں صرف بولنا سننے کی طرح اہمیت کا حامل نہیں ہوگا۔

تعلیمی میدان میں دستیاب مواقع

کالج اور یونیورسٹیاں علم وعمل کے ایسے چشمے ہوتے ہیں جہاں سائنسی تحقیقاتی طریقہ کار کے مطابق نت نئے علوم پڑھائے جاتے ہیں۔بعض اوقات علم حاصل کرنے والے لوگ بھی باقاعدہ علم اور عوامی رائے پر مشتمل علم کے فرق کو سمجھتے ہیں۔ایک ایسا علم جو ایک فرد کی کسی معاملے پر رائے سے متعلق ہوتا ہے اور ہر شخص کی اس پر اپنی ہی معلومات ہوتی ہیں۔اس فرق کو سمجھ کر ہی وہ طریقہ کار سمجھا جاسکتا ہے جس کے ذریعے شہری اپنی معلومات بڑھاتے ہیں اور عملی دانائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔اس عوامی علم کو بعض اوقات عمومی رائے قرار دے کر نظر انداز کردیا جاتا ہے۔اس دوران اس علم میں موجود حقائق اور انسانی فیصلہ سازی سے متعلق معلومات کو بھی یکسر رد کر دیا جاتا ہے۔

تعلیمی وظائف کی وضاحت کرنا

تعلیمی میدان میں کی جانے والی زیادہ تر ریسرچ کا مرکز باقاعدہ سائنسی علم اور عوامی علم ہی رہا ہے۔ لوگوں نے تجربات کے ذریعے ان کے مابین موجود فرق کو سمجھنے کی کوشش کی۔ 'پبلک سکالرشپ' نامی میدان میں اس تحقیق کو ایک نئے انداز میں آگے بڑھایا جا رہا ہے کیونکہ کچھ پروفیسرز کا خیال ہے کہ انہیں مستند رائے دینے سے بڑھ کر کچھ کردار ادا کرنے کی ضرورت ہے۔ انہوں نے اپنے پیشہ ورانہ علم کو یکسر رد تو نہیں کیا بلکہ انہیں یہ بات سمجھ آ گئی ہے کہ ان کے ذاتی علم کی حدود کیا ہیں؟

پروفیسر الجانڈرو سانز ڈی سانٹا ماریہ اس کی سب سے بڑی مثال ہیں۔ ان کی ریسرچ کا موضوع کولمبیا کے دیہاتی علاقوں کی معاشی ترقی ہے۔ دیہاتی علاقوں پر تحقیق کے دوران انہیں زمین کی خصوصیات، موسمیاتی حالات اور آبادی میں اضافے کے تناسب سے متعلق اہم حقائق کا علم ہوا۔ اس کے باوجود جب وہ ریسرچ کے اگلے مرحلے میں پہنچے تو انہیں محسوس ہونے لگا کہ ان کے اعداد و شمار ان علاقوں کے سماجی نظام سے مختلف تھے۔ یہاں تک کہ نئی معلومات کے اکٹھے کرنے کا طریقہ کار تک بھی انہیں غیر متعلق سا لگنے لگا۔ بعد ازاں اس صورتحال کی وجہ سے پروفیسر کا ریسرچ کرنے اور پڑھانے کا طریقہ کار یکسر تبدیل ہو گیا۔ انہوں نے یہ مفروضہ مکمل طور پر ترک کر دیا کہ دیہاتیوں کی بری حالت ہے اور انہیں ان کی حالت بہتر کرنی ہے۔ اس کی بجائے انہوں نے وہاں کے مقامی حالات اور وسائل سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے ایسے طریقہ کار وضع کئے جن سے وہ اپنا پیشہ ورانہ علم ان دیہاتیوں تک اس انداز میں پہنچا سکتے تھے جس سے شہریوں کو یہ علم اپنے سے متعلقہ ہی محسوس ہوتا تھا۔ یعنی انہوں نے اپنے علم اور دیہاتیوں کے علم میں مطابقت پیدا کر لی تھی۔

سماجی ترقی اور سماجی صحت کے میدان میں اس طرح کے کئی مزید تجربات بھی کئے گئے ہیں۔ معاونت پر مبنی علوم کے میدان میں بھی یہ ریسرچ جاری ہے۔ ریاست پین میں پروفیسر ٹیڈ ایلٹر نے بھی پیشہ ورانہ علوم اور عوامی منصوبوں میں مطابقت قائم کرنے سے متعلق تحقیق کو مزید وسیع کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی طرح سکاٹ پیٹرز نے ایسی تحقیقات کرنے والے افراد کے بارے میں معلومات جمع کی ہیں۔ انہوں نے اپنے کام میں ایسے معلموں کی کہانیاں شامل کی ہیں جنہوں نے عوامی علوم سے متعلق ریسرچ کی۔ ریاست مشی گن کے پروفیسر فرینک فیئر نے استاد کے روایتی معاشرتی کردار کو وسعت دینے سے متعلق بات کی ہے۔ تاہم میرا خیال ہے کہ ایسے تمام لوگوں کا یہاں تذکرہ ہمیں اس کتاب کے اصل موضوع سے دور لے جائے گا۔

ایک اور معاملے میں نہ صرف چند پروفیسرز بلکہ ساری یونیورسٹی نے ہی 'پبلک سکالرشپ' کی اہمیت کو تسلیم کیا۔ یہ اوبرن یونیورسٹی ہی تھی جس کے تحت سگز ویل کے علاقے میں تجربات کئے گئے۔ جن کا تذکرہ پچھلے بابوں میں کیا جا چکا ہے۔

اس کام کا آغاز اس وقت کیا گیا جب نئے میئر کے انتخاب کے بعد تکنیکی معاونت کا منصوبہ بری طرح متاثر ہوا۔ پہلے میئر یونیورسٹی کا اتحادی تھا مگر اس کے بعد آنے والے منتظم کی خواہش تھی کہ وہ اپنا منصوبہ شروع کرے۔ یوں یونیورسٹی کو پیشہ ور ماہر کی حیثیت سے بڑھ کر کچھ کرنا پڑا۔ کچھ ایسا جس کو میں نے جمہوری روایات کا نام دیا ہے۔ بعض اوقات تو یونیورسٹی کی طرف سے شروع کئے جانے والے منصوبے یہیں تک محدود تھے کہ اس نے کرسیوں کو قطاروں کی بجائے دائرے میں رکھنے کی کوشش کی تا کہ اجتماعیت کا احساس پیدا ہو۔ دوسری جانب یونیورسٹی نے لوگوں کو منصوبوں میں شامل کرنے کے نئے نئے طریقہ کار بھی وضع کئے جو کہ ایک بڑی سماجی خدمت تھی۔

شہریوں کے کردار پر غور کرنا

کئی دوسرے اداروں کی جانب سے بھی عوام اور ماہرین کے کام میں مطابقت پیدا کرنے کے منصوبوں پر کام کیا گیا۔ یہ تجربات اس لئے اہمیت کے حامل ہیں کہ ان کی وجہ سے شہریوں کی قدر و قامت اجاگر ہوتی ہے۔ کئی ادارے عوامی مباحثوں کے طریقہ کاروں پر تجربات کر رہے ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ عوام میں مسائل کو بہتر انداز میں دیکھنے اور ان کے مجوزہ حل کو موثر طریقے سے زیر بحث لانے کی صلاحیت پیدا کرنا ہے۔ شہریوں کو اس عمل کے دوران مسائل کو مناسب نام دینے کی مشق بھی کروائی جاتی ہے۔ تاہم اس عمل کے دوران انتہائی احتیاط کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ مباحثے کیلئے ایسے موضوعات پیش کرنے ہوتے ہیں جن کی وجہ سے معاشرے میں تقسیم پیدا ہونے کا خدشہ نہ ہو۔ بلکہ ان موضاعات میں یہ طاقت ہوتی ہے جو علاقائی حد بندیاں، انتخابی حد بندیاں ختم کر سکیں اور معاشرے کے بنیادی مسائل کے خاتمے کیلئے سمندری حدود پر حفاظتی باڑیں تعمیر کرنا اور کم عمر کے حمل پر قابو جیسے اقدامات کئے جا سکیں۔

مختلف علاقوں میں قائم کئے جانے والے کیمپس سینٹرز یوں تو مختلف نظر آتے ہیں مگر عوامی موضوعات پر ریسرچ کرنے والے ان اداروں کی جڑیں دراصل ایک ہی ہیں۔ یہ مراکز تو درحقیقت قائم بھی مختلف تحقیق دانوں کی طرف سے کئے گئے تھے۔ کچھ مراکز کو مقامی لوگوں کی جانب سے قائم کیا گیا۔ ان میں سے بعض کو چلانے کیلئے مخصوص بورڈ موجود ہیں اور کچھ غیر منافع بخش مقاصد کیلئے کام کر رہے ہیں۔ انہیں مختلف اداروں کی جانب سے مالی تعاون فراہم کیا جاتا ہے۔ کیٹرنگ سے ہٹ کر کچھ خود مختار مراکز کے کچھ ایسے اداروں سے بھی تعلقات ہیں جو مشترکہ مفادات کیلئے کام کر رہے ہوتے ہیں۔

پچھلے دو عشروں میں ان مراکز کی تعداد میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ اس کی وجہ شاید موجودہ سیاسی نظام میں دبتی ہوئی عوامی آواز بھی ہے۔ اس کی وجہ سماجی مسائل کو حل کرنے کیلئے اٹھائی جانے والی مقامی آوازیں بھی ہیں۔ ایسا اردگرد کے علاقوں میں ہونے والے کاموں کی وجہ سے بھی ہوا ہے۔

یہ مراکز کئی میدانوں میں اپنے لئے معاونین بھی تلاش کر رہے ہیں۔ یوں سیاسی سائنسدان بھی سماجی مباحثوں میں دلچسپی لینے لگے ہیں اور فلسفہ دانوں کی جانب سے عوامی مباحثے کی تھیوریاں پیش کی جارہی ہیں جبکہ صحافتی حلقوں نے عملی دانائی اور سماجی اقدار کی بنیاد پر فیصلہ سازی سے متعلق امور پر نظر ثانی کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یوں معاون علوم کی شاخ کی اپنی جمہوری جڑیں مضبوط ہونے لگی ہیں۔ اس کے نتیجے میں معاشروں میں موجود کسانوں کے مابین تعاون کی کمی ہوتی کو ایک بار پھر سے دیکھنے کا موقع بھی ملا ہے۔

اگر کسی معاشرے میں خرابیوں پر قابو پانا درکار ہے تو اس کا واحد طریقہ یہی ہے کہ وہاں کے عوام کو اپنے مسائل کا حل نکالنے کیلئے تیار کیا جائے۔ مسائل کا حل نکالنا ایک بڑا کام ہے اور مختلف مراکز یہ کام کرنا بخوبی جانتے ہیں۔

ان مراکز میں سے کچھ تو مقامی سکولوں سے یہ بات چیت بھی کر رہے ہیں کہ عوامی مباحثے کا موضوع طلباء کے لازمی سلیبس میں شامل کیا جائے۔ اس کی وجہ سے سکولوں میں ہونے والے کام کی جمہوری روایات کے ساتھ براہ راست مطابقت پیدا کی جاسکتی ہے۔ ہوفسترا یونیورسٹی اور وسکونسن یونیورسٹی کے مراکز میں اس طرح کی سماجی تحقیق جاری ہے۔ ایسے ہی کئی دیگر ادارے اپنے کام کیلئے سکولوں اور کالجوں میں پڑھانے والے اساتذہ کے ساتھ رابطے میں ہیں۔ اس کی وجہ سے انہیں معلموں کے نئے نئے گرہوں کے ساتھ تعلقات قائم کرنے میں بھی مدد ملتی ہے۔

الباما میں قائم ایک مرکز امریکی شعبہ تعلیم، سوشل سٹڈیز کونسل اور گرمیوں کی چھٹیوں میں اساتذہ کو پڑھائے جانے والے تربیتی مضامین کا علم دینے والے اداروں سے مل کر کام کر رہا ہے۔ اسی طرح ہوفسترا یونیورسٹی میں قائم مرکز ان طالبعلموں کے ساتھ مل کر کام کرتا ہے جنہیں بطور استاد کام کرنے کے سرٹیفکیٹ ملنے والے ہوتے ہیں۔ انہیں مباحثی سیاست سے متعلق تعلیم دی جاتی ہے۔ دوسری جانب وسکونسن میں قائم مرکز سکول سے نکالے جانے والے طلباء کے معاملے پر کام کر رہا ہے۔ یہ کام کرنے کیلئے مقامی سکول کی انتظامیہ کو بھی پروگرام کا حصہ بنایا گیا ہے۔ الباما میں مائلز کالج اور یونیورسٹی آف نارتھ آئیوا میں قائم مراکز میں اس طرح کے مزید تجربات کئے جارہے ہیں۔

کالج کے طلباء کو ایک الگ قسم کی سیاست سے متعارف کروانا

میرا خیال ہے کہ تعلیمی اداروں اور عوام کے کام میں بہتر تعلق قائم کرنے میں یونیورسٹی میں پڑھنے والے طلباء مرکزی کردار ادا کر سکتے ہیں۔ اس عمل کا آغاز ایک ایسے نکتے سے ہوتا ہے جہاں طالبعلموں کو اس کام سے متعارف کروایا جاتا ہے جس کے ذریعے شہری آپس میں مل جل کر مسائل سے نجات پا سکتے ہیں۔ اس ضمن میں کام کرنے والے مختلف مراکز پر طالبعلموں کو عوامی مباحثے اور فیصلہ سازی کی تربیت دی جاتی ہے۔ دوسری جانب کچھ

جگہوں پر تو اس سے متعلق مواد کو سلیبس میں بھی شامل کیا گیا ہے۔ اس مقصد کیلئے مقامی اساتذہ کی مدد حاصل کی جاتی ہے۔ اسی طرح کا ایک تجربہ ویک فاریسٹ میں مسلسل چار سال تک کیا گیا۔ اس تجربے کے مکمل نتائج کو پروفیسر کیٹی ہیر یگرا اور جل میک ملن نے اپنی کتاب 'سپیکنگ آف پالیٹکس' میں بھی درج کیا ہے۔

اس تجربے کا مختصر تذکرہ کیا جائے تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ اس دوران ویک فاریسٹ میں طلباء ایک گروہ کو مباحثی سیاست سے متعارف کروایا گیا۔ انہیں کلاس روم، یونیورسٹی اور قریبی علاقے کے عوامی سیاسی معاملات میں شامل کیا گیا۔ اس دوران انہیں یہ سکھایا گیا کہ عوامی مباحثے صرف فورمز تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ یہ تو ایک باقاعدہ طرز زندگی ہے۔ جس میں جمہوری روایات کو اولین حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ پروفیسرز نے اس دوران دیکھا کہ مباحثوں میں اساتذہ کے مختلف کرداروں پر بھی بات چیت کی گئی۔ استاد کو بطور استاد، ریسرچر اور شہری پیش کیا گیا۔ اس پر مباحثہ کیا گیا۔ ان تمام کرداروں پر مختلف نوعیت کے سوالات بھی اٹھائے گئے۔ ایسا ہی کچھ پروفیسر الجانڈرو کو بھی اپنی تحقیق میں دیکھنے کو ملا تھا۔

یہاں کئے گئے تجربے کا سب سے اہم ترین حصہ اس تجربے کا حصہ بننے والے طلباء پر پڑنے والے اثر کا جائزہ لینا تھا۔ اس کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے ایک طالبہ نے کہا کہ اس کی وجہ سے اس کی ساری زندگی یہاں تک کہ ذاتی معاملات تک پر اثر پڑا ہے۔ سب سے گہرا اثر دوسرے شہریوں کے ساتھ وابستہ تعلقات پر پڑا تھا۔ اس دوران طلباء کو معلوم ہوا کہ سیاست صرف اپنے نمائندوں کو منتخب کرنے تک ہی محدود نہیں ہے۔ اور یہ نئی سوچ پیدا ہونے کے سبب انہیں ایسے کئی مواقع بھی نظر آنے لگے جہاں وہ بھی کوئی سیاسی کردار ادا کر سکتے تھے۔

دوسرے مراکز پر کئے جانے والے تجربات میں سے کئی کے نتائج سامنے آنا ابھی باقی ہے۔ یہ تجربات زندگی کے مختلف میدانوں میں سامنے آنے والے مسائل سے متعلق تھے۔ ان سب کا مقصد ان کو یہی سکھانا تھا کہ عوام کس طرح معاشرے میں موثر کردار ادا کر سکتے ہیں اور کئی مسائل کا حل نکال سکتے ہیں۔ طلباء کسی معاشرے کا اسی طرح حصہ ہوتے ہیں جیسے وہ کسی تعلیمی ادارے کا حصہ ہوتے ہیں۔ وہ کسی خاص مضمون میں داخلہ لیتے ہیں اور ان اپنے تمام تر کام کا ثمر ملتا ہے۔ انہیں وہاں مختلف کاموں میں شامل ہونے کے مواقع میسر آتے ہیں مگر انہیں اجتماعی فیصلہ سازی یا سماجی مسائل کا حل نکالنے سے متعلق تجربات کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ ایسے پروفیسرز جو ان مراکز پر کئے جانے والے تجربات کی نگرانی کرتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ وہ پوری کوشش کرتے ہیں طلباء کو نصابی اور ہم نصابی تمام سرگرمیوں کا ہی حصہ بنایا جائے۔ تاکہ انہیں مختلف سوچ رکھنے والے لوگوں کے ساتھ مل کر کام کرنے اور مسائل کا حل نکالنے کی تربیت مل سکے۔

عمومی تعلیم کے میدان میں موجود مواقع

ہمارے سکول جو عوامی اعتماد میں نظر آنے والی کمی کی بڑی وجہ ہیں، میں تجربات کے ذریعے سماجی

منصوبوں سے مطابقت پیدا کرنا ایک بڑی کامیابی ہوسکتی ہے۔اس سے واقعی کوئی تبدیلی آسکتی ہے۔جیسے جیسے عوام کی نظر میں سکولوں کی طرف سے دیئے جانے والے درعمل کے سبب ان کی قدر ومنزلت کم ہوتی جارہی ہے ویسے ویسے سکولوں کی طرف سے دوطرفہ تبادلہ خیال کے ذریعے صورتحال کو بہتر کرنے کی کوششیں سامنے آرہی ہیں۔ سکول اس عمل کے ذریعے والدین کو منصوبوں کا حصہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔لیکن اس سب کے باوجود عدم اعتماد کی فضا تاحال قائم ہے۔

تعلقات عامہ سے عوام کو شامل کرنے تک

سکولوں اور عوام کے کام میں مطابقت پیدا کرنے کے تجربات کے بارے میں بات چیت سے پہلے میں سکولوں اور عوام کے مابین تعلقات بہتر کرنے کی کوششوں کے اثرات پر بات کرنا چاہتا ہوں۔ان کوششوں کے ناقدین کا کہنا ہے کہ یہ کوششیں شہریوں کی طرف سے کی گئی ہیں نہ ہی ان کی وجہ سے عوام اور سکولوں کے درمیان تعلقات بہتر ہوئے۔کسی حد تک یہ منصوبے ابھی تک بھی جاری ہیں۔میرے خیال میں عوام اور سکولوں کے درمیان پیدا ہونے والے خلا کو پر کرنے کیلئے کئی مواقع دستیاب ہیں۔ایسا صرف اس صورت ہی ممکن ہے جب ایسی کوششیں جاری رہیں۔خاص طور پر عوامی شمولیت کی ان کوششوں کی وجہ سے مستقبل پر زیادہ سے زیادہ عوامی کنٹرول کا خواب ضرور پورا ہوسکتا ہے۔

جیسا کہ پچھلے باب میں بھی تذکرہ کیا گیا ہے کہ سکولوں کی جانب سے اعتماد کو بحال کرنے کی کوششوں میں خوداحتساب کیلئے بھی پیش کیا جاتا ہے۔جہاں اس طریقہ کار پر کئی تحفظات موجود ہیں وہیں اس کو بہتر کرنے کی کوششیں بھی کی جارہی ہیں۔اس کیلئے سکولوں کی انتظامیہ کو محض اداروں کے امیج کو بہتر کرنے سے آگے بڑھ کر کچھ کرنا ہوگا۔نیشنل سکول پبلک ریلیشنز ایسوسی ایشن کی جانب سے تعلقات عامہ کو عوامی شمولیت سے تبدیل کرنے پر زور دیا جاتا ہے۔اس تنظیم کی تجویز پر عمل کر کے عوامی منصوبوں اور سکولوں میں مطابقت پیدا کرنے کے تجربات کا دروازہ کھل سکتا ہے۔

ایسی کسی کوشش کا آغاز اگر عوام کی جانب سے کیا جائے تو اس کو زیادہ پذیرائی ملنے کی توقع ہے۔ایک اور تنظیم 'ساؤتھ ویسٹ ایجوکیشنل ڈویلپمنٹ لیبارٹری' نے کچھ ایسی تنظیموں کے کام کا جائزہ لیا جو سکولوں اور کمیونیٹیز سے کہیں ہٹ کر کام کرتی ہیں۔دوسرے الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان تنظیموں کی جانب سے روایتی طریقہ کار سے کام نہیں کیا جاتا بلکہ یہ منصوبے والدین یا مقامی لوگوں کے ایک بورڈ کی جانب سے شروع کئے جاتے ہیں۔یہ وسیع تر تعلیمی مقاصد کیلئے کام کرتے ہیں۔ایسے کاموں کے ذریعے عوام اور سکولوں میں بہتر تعلق قائم کرنے کے تجربات کئے جاسکتے ہیں۔

عوام کی جانب سے شروع کئے جانے والے دیگر منصوبے نا تو براہ راست سکول انتظامیہ کو نشانہ بناتے

ہیں اور نہ ہی ان کی طاقت کو کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بلکہ یہ صرف سکولوں اور مقامی لوگوں کے مابین پائے جانے والے تلخ تعلقات کو تبدیل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا مقصد تعلیمی مسائل پر قابو پانے کیلئے عوامی استعداد کار میں اضافہ کرنا ہوتا ہے۔ اس کی وجہ سے عوام اور جمہوریت دونوں کا ہی فائدہ ہوتا ہے۔

ان منصوبوں کا جائزہ لینے کا بعد ریسر چر کلیرنس سٹون کا کہنا ہے کہ یہ منصوبے تعلق کے ارتکاز کو چیلنج کرنے کی بجائے صرف سکول اور عوام کے مابین تعلقات کو بہتر کرنے تک ہی محدود ہیں۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ 1960 اور 1970 کی دہائیوں میں شہریوں کی طرف سے اس مقصد کیلئے انتہائی اقدامات اٹھائے گئے تو ان کے مناسب نتائج سامنے نہ آ سکے۔ تاہم ان کا خیال ہے کہ مسائل حل کرنے کی سماجی استعداد کار میں اضافے سے صورتحال کی بہتری ممکن ہے۔ استعداد کار میں اضافہ کسی طرح بھی سامنے آئے ہمیشہ مثبت ہی ہوتا ہے اور اسی کے ذریعے سکولوں اور عوام کے کام میں مطابقت پیدا کی جا سکتی ہے۔ اور پھر سکولوں کے مسائل کچھ بھی ہوں ان کا حل نکالنا ضروری بھی ہے اور یہ حل عوام کو ہی نکالنا ہے۔

ہر اس چیز کا استعمال کرنا جو باعث علم ہے

سکولوں کے کردار سے مایوس ہو کر بعض اوقات شہریوں کی جانب سے کچھ ایسے منصوبے شروع کئے گئے جہاں وہ کام کرنے کی کوشش کی گئی جو کام ان کے مطابق سکولوں میں نہیں کئے جا رہے تھے۔ میں یہاں کمیونٹی سکول یا بچوں کو گھر پر پڑھانے کا تذکرہ نہیں کر رہا بلکہ میں بچوں میں آگہی پھیلانے کیلئے کئے جانے والے سماجی تجربات کی بات کر رہا ہوں۔ ایسی کوششیں جن کے ذریعے ان مسائل کا حل نکالنے کی کوشش کی جاتی جن سے متعلق عوام سکولوں کو لے کر مایوس ہو چکے ہوتے ہیں۔

جو لوگ معاشرے میں موجود وسائل کو استعمال کر کے تعلیم پھیلاتے ہیں انہیں سماجی اساتذہ کہا جا سکتا ہے۔ یہ اپنے کام کے ذریعے سکولوں میں کئے جانے والے کام کی معاونت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مختلف علاقے لائبریریوں، عجائب گھروں اور سماجی مراکز کے ذریعے اپنے بچوں میں علم کی روشنی پھیلا رہے ہیں۔ اس کے مقابلے میں سماجی اساتذہ وہ ذرائع استعمال کرتے ہیں جس طرح کی مثال ابتداء میں پیش کی گئی تھی۔ جہاں لیگزنگٹن میں ایک شخص نے پرانے قبرستان کے ذریعے بچوں کو تاریخ سے متعلق معلومات فراہم کیں۔ ایسے کام کرنے والے لوگ پیشہ ور، کاروباری شخصیات، پولیس والے یا کسی دوسرے عام شخص کے روپ میں موجود ہو سکتے ہیں۔ بنیادی طور پر ان سماجی استادوں کے کام کا مقصد ثقافتی پہچان بنانا یا بچوں کی اخلاقی تربیت کرنا ہوتا ہے۔

ان سماجی استادوں اور سکولوں میں کئے جانے والے کام میں انتہائی ضروری ہے۔ سکولوں کی جانب سے آگہی پھیلانے کے شہری منصوبوں کی جتنی حوصلہ افزائی جائے گی۔ سکولوں کو اس کا اتنا زیادہ فائدہ ہو گا۔ یوں سکولوں اور سماجی استادوں کی جانب سے کیا جانے والا کام جتنا بہتر ہوتا جائے گا، معاشرے میں اتنی ہی موثر تبدیلی

آتی جائے گی۔

روایتی طور پر سماجی استاد نہیں سمجھتے کہ وہ لوگوں کو تعلیم دے رہے ہیں۔ کم از کم وہ یہ کام باقاعدہ اساتذہ کی طرح سرانجام نہیں دے رہے ہوتے۔ اس کے باوجود وہ علم کی روشنی پھیلا رہے ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں جب لوگ تعلیم دینے کی بات کر رہے ہوتے ہیں اس کا مقصد ان کی مدد کرنا ہوتا ہے۔ تاکہ وہ بہتر طور پر علم حاصل کر سکیں۔ ایک گرجا گھر میں جانے والے لوگوں میں پھیلنے والی تعلیم سے متعلق ایک تجربے کا تذکرہ پہلے بھی کیا گیا ہے۔ جس میں لوگ یہ نہیں سمجھتے تھے کہ انہوں نے کوئی تعلیم مہیا کی ہے مگر دراصل یہ عمل تو وقوع پذیر ہو ہی تھا۔ یا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کا کام کرنے کا طریقہ کار سکولوں کے عمومی عمل سے ذرا مختلف ہوتا ہے۔

میرین براڈے جو کہ سابق استاد اور سکول منتظم ہیں، نے تعلیم حاصل کرنے کے عمل کو کچھ یوں کہا ہے 'یہ ایک ایسا عمل ہے جس میں بچوں کو دنیا کو بہتر انداز میں دیکھنے میں مدد فراہم کی جاتی ہے۔' اب یہ عمل شاید اسی طرح نظر آئے جس طرح کے مقاصد لے کر سماجی اساتذہ علم پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں۔

یہاں ایک بار پھر یہ بتانا ضروری ہے کہ سکولوں اور عوام میں مطابقت پیدا کرنے کا مطلب کلاس روم میں کیئے جانے والے کام اور کمیونٹی کی جانب سے کیئے جانے والے اقدامات میں ہم آہنگی پیدا کرنا ہے۔

شہریوں کو بحث کا مرکز بنانا

سکولوں اور عوام کے کام میں مطابقت پیدا کرنے کا سب سے بڑا مقصد نئی نسل کو بہتر شہری بنانا ہے۔ کسی بھی معاشرے کے ماں باپ، مذہبی تنظیمیں اور مقامی کلب اس بات پر سب سے گہرا اثر ڈالتے ہیں کہ بچے بڑے ہو کر کیسے شہری بنیں گے۔ جب سکول اور معاشرہ مل کر کام کر رہے ہوں تو سکولوں کے پاس عوام کی مدد کر کے مقاصد حاصل کرنے کی واضح گنجائش موجود ہوتی ہے۔ یوں پورے معاشرے کی سماجی تربیت کی جا سکتی ہے۔

افسوس کی بات ہے کہ ماضی قریب میں معاشرت کا فوکس شہریوں سے ہٹ گیا ہے جبکہ اس سے پہلے امریکی تعلیمی اداروں کا مقصد شہریوں کی تربیت کرنا بھی ہوتا تھا۔ ابتداء میں قائم کیئے جانے والے سکولوں کا بنیادی کام عوام کی خدمت کرنا تھا نہ کہ دوسرے کام سرانجام دینا۔ ان کی ذمہ داریوں میں امریکہ میں آنے والے عظیم انقلاب کی تکمیل بھی شامل تھی۔ جس کے ذریعے جمہوری نظام کے قیام کے خواب کو ایک حقیقت میں تبدیل کیا جانا تھا۔ اس کے بعد سماجی تعلیم سے جڑے ہوئے معاملات مختلف ہونے لگے۔ اس تعلیم کے مقاصد تبدیل ہونے لگے۔ ان سکولوں کا فرض تھا کہ لوگوں کو ایک قوم تشکیل دیں۔ وہ لوگ جو ایسے گروہوں پر مشتمل تھے جن کے درمیان صدیوں پر محیط لڑائیاں موجود تھیں۔ انہیں سماجی تربیت کے ذریعے ہی باہم جوڑ کر ایک نئی قوم بنایا جا سکتا تھا۔ یہی تربیت امریکی ثقافت کو دوسروں سے الگ کرتی تھی۔

انیسویں صدی میں بھی تعلیمی اداروں میں سماجی تربیت جاری رہی۔ اس کی مختلف شکلیں تھیں جیسا کہ قومی نغمے، مشہور امریکیوں کی زندگی کی داستانیں اور نئے ملک کی تاریخ۔ سماجی تربیت ایک قومی مشغلہ بن گیا تھا۔ اس کا تعلق عوام اور حکومت دونوں سے تھا۔ اسی سماجی ذمہ داری سمجھا جاتا تھا۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ انیسویں صدی میں نوجوانوں کو ایک الگ قسم کی سیاست سے بھی متعارف کروایا جاتا تھا۔ اس دوران ترتیب پانے والے کئی ثقافتی تہوار آج بھی منائے جاتے ہیں۔ لیکن یہاں بات کرنے کا مقصد اس زمانے کی تعریف میں پل باندھنا نہیں ہے۔ بلکہ غرض یہ کہنا ہے کہ سماجی تربیت یا معاشرتی تعلیم کا تعلق شہریوں کے دوسرے شہریوں کے ساتھ رشتے اور شہریوں کے حکومت کے ساتھ قائم ناتے سے ہوتا ہے نا کہ یہ صرف ریاست اور شہریوں کا آپس کا معاملہ ہے۔

بیسویں صدی کے آغاز تک امریکہ کا سیاسی نظام تبدیل ہوتا جارہا تھا۔ اور ساتھ ہی ساتھ مقامی سماجی تربیتی نظام بھی تبدیل ہو گیا تھا۔ ہم نے ماہرانہ حقائق کو اہمیت دی۔ جن کو صرف جاننا ضروری تھا نہ کہ سمجھنا۔ سیاسیات کو کاروبار سرکار تک محدود کر دیا گیا۔ یوں ساری علوم کو سماجی تعلیم سمجھنے کا نظریہ تبدیل ہو گیا اور ہم کسی ایک ہی مضمون کے پیشہ ور بننے کو اہمیت دینے لگے۔ جیسا کہ سیاسیات کی بجائے صرف کار سرکار کی تعلیم دی جانے لگی۔ اسی طرح سائنس کے مضمون کو معاشرے سے نکال کر کلاس روم تک محدود کر دیا گیا۔

اکیسویں صدی کے آغاز میں معلمین اور سماجی مضامین کے ماہرین بری طرح متاثر ہونے والی سماجی تربیتی تعلیم سے متعلق خطرناک باتیں کرنے لگے۔ انہی میں سے کچھ نے مطالبہ کیا کہ معاشرت کو صرف تاریخ اور چند چیدہ اقدار سے بڑھا کر شہریوں کو اس تعلیم کا مرکز بنایا جائے۔ ایسے شہری جو باقاعدہ سیاسی طاقت ہوں نہ کہ صرف رضا کار اور ووٹ ڈالنے والے۔

اس ماحول کی وجہ سے سکولوں کو ایک بار پھر یہ موقع ملا ہے کہ وہ کلاس روم میں کئے جانے والے کام کو سماجی کاموں کے مطابق ڈھال لیں۔ تاکہ یہ کام ایک دوسرے کی طاقت بن کر مکمل ہو جائیں۔ اس کے نتیجے میں ایسے شہری پیدا ہونے چاہئیں جو فعال کردار ادا کر سکیں۔ جو یہ جانتے ہوں کہ کس طرح دوسرے شہریوں کے ساتھ مل کر مسائل سے نمٹا جاسکتا ہے۔ اور جن لوگوں کے ساتھ مل کر وہ کام کر رہے ہوں وہ انہیں اس انداز سے سکھا رہے ہوں کہ کلاس روم میں کئے جانے والے کام کی معاونت ہو رہی ہو۔ یوں ایسے سماجی استاد باقاعدہ اساتذہ کے ساتھ مل کر مثالی کردار ادا کر سکتے ہیں۔

ایسے تجربات پہلے ہی سے کئے جارہے ہیں جن کے نتیجے میں طلباء کو اجتماعی فیصلہ سازی اور مسائل سے نمٹنے کی تربیت دی جاتی ہے۔ اوبرن یونیورسٹی کے طلباء گرمیوں کی چھٹیوں میں الباما کی کمیونٹیز میں سماجی شمولیت کے منصوبوں پر کام کرتے ہیں۔ اس عمل کو زندہ و جاوید جمہوریت قرار دیا جاسکتا ہے۔ برمنگھم کے علاقے میں بھی طلباء نوجوانوں میں بڑھتے ہوئے تشدد کے واقعات پر مباحثے منعقد کر رہے۔ دور دراز جزیروں پر واقع سکولوں

میں بھی کلاس روم کے اندر ہی مباحثے منعقد کروانے کی مشقیں کی جاتی ہیں۔

سکول کے مسائل کو معاشرے کے مسائل کے طور پر پیش کرنا

عوامی کاموں سے مطابقت کرنے کے دوران اداروں کو اپنے مقاصد بھی پورے کرنے ہوتے ہیں۔ اور میرے خیال میں سکولوں کے مقاصد حاصل کرنا اب پہلے سے زیادہ آسان کام ہے کیونکہ یہ حقیقت کسی حد تک تسلیم کر لی گئی ہے کہ سرکاری ادارے عوامی مدد کے بغیر اپنا کام مکمل نہیں کر سکتے۔ یعنی سکول ایسے تمام مسائل پر اکیلے قابو نہیں کر سکتے جو کلاس رومز تک پھیلے ہوئے ہیں۔ انہیں یہ کام کرنے کیلئے سماجی امداد درکار ہوتی ہے۔ یوں سکولوں کو اپنا کام مکمل کرنے کیلئے سماجی استعداد کار میں اضافہ درکار رہتا ہے تاکہ عوام ان کا ہاتھ بٹا سکیں۔

کلوراڈو میں سکول کے مسائل کو بطور سماجی مسائل پیش کرنے کا ایک تجربہ کیا گیا۔ اس دوران کام کرنے والوں کو ہیلتھ ایجوکیشن کیلئے ایک بڑی گرانٹ ملی جس کے ذریعے جنسی تعلیم پر ایک مضمون با آسانی شروع کیا جا سکتا تھا۔ مگر اس معاملے پر معاشرے میں تقسیم پیدا ہو گئی۔ اس صورتحال میں سکول انتظامیہ سے کوئی فیصلہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا یہ گرانٹ منسوخ کر دی گئی۔ اس کی وجہ سے جھگڑا مزید بڑھ گیا۔

اس کے بعد سکولوں کی تنظیم نے مقامی معاشرے میں پائے جانے والے مسائل کے بارے میں ریسرچ کا آغاز کیا۔ اس دوران یہ بات سامنے آئی کہ عوام کی اکثریت کو تو اس گرانٹ والے معاملے میں دلچسپی ہی نہیں تھی۔ انہیں جنسی تعلیم کی بجائے کم عمری میں حاملہ ہونے والی لڑکیوں سے متعلق خدشات تھے۔ اس خدشے کے سبب جنسی تعلیم کا مضمون پڑھانے کا معاملہ بھی متنازع بن گیا۔ اس کے بعد مقامی لوگوں کے اجلاس میں یہ مسئلہ اٹھایا گیا تو اس کو ایک نام کے ساتھ تسلیم کر لیا گیا۔ ساتھ ہی انہوں نے منصوبے میں یہ تبدیلی بھی کی کہ لڑکیوں کے کم عمری میں حاملہ ہونے کے معاملے کا تدارک بھی کیا جائے گا۔ اس مقصد کیلئے انہوں نے کئی ایک سماجی ذرائع استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔

مسائل کو مناسب نام دے کر عوامی حمایت حاصل کر کے سکولوں کو کلاس روم کے کام میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ معاشرے میں پیش آنے والے واقعات سے عام طور پر اساتذہ انتہائی پریشانی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ وہ ایسے سماجی معاملات کو سنجیدہ لیتے ہیں جو کلاس روم کے باہر پیدا ہوتے ہیں مگر ان کے اثرات کلاس روم میں بھی نظر آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ یہ مسائل اس وقت سنگین صورتحال اختیار کر لیتے ہیں جب یہ طالبعلموں کے رویے پر اثر انداز ہونا شروع کر دیں۔ مجھے یاد ہے کہ ٹیکساس کے شہر ہیوسٹن کے ایک استاد نے مجھے بتایا تھا کہ 'میں اپنے وقت کا 60 فیصد نظم و ضبط اور 20 فیصد انتظامی معاملات میں صرف کرتا ہوں اور اگر مجھے وقت ملے تو میں اس کا 20 فیصد پڑھانے میں بھی لگا لیتا ہوں' اسی طرح دیگر سکولوں کی انتظامیہ کا بھی کہنا ہے کہ انہیں بچوں کی پرورش میں ایک بڑا حصہ ڈالنا ہوتا ہے۔ یہاں تک ان کو کھانا کھلانے اور سکول کے بعد ان کی دیکھ بھال بھی کرنا پڑتی ہے۔

اگر یہ تاثر پیدا کر لیا جائے کہ مسائل صرف سکول کے ہی نہیں ہیں بلکہ معاشرے کے ہیں تو ان مسائل کے جواب میں سامنے آنے والا عوامی ردعمل بھی یقیناً مختلف ہوگا۔ ایک وکیل جو کہ پہلے ایک سکول میں خدمات سر انجام دے چکے تھے ان کا کہنا تھا کہ نظم وضبط سے متعلق معاملات پر میٹنگ میں والدین کم ہی شریک ہوتے ہیں۔ اس کے بعد جب وہ ضلع کے سرکاری وکیل بنے تو انہوں نے دیکھا کہ کم عمری میں جرائم کی طرف راغب ہونے والے بچوں کے معاملے پر ہونے والی میٹنگ میں لوگوں کی ایک بڑی تعداد شریک ہوتی ہے۔ نظم وضبط اور کم عمری کے جرائم ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں مگر ان معاملات پر سامنے آنے والا عوامی ردعمل یکسر مختلف ہے۔ اس کی کیا وجہ ہوسکتی ہے؟ شاید اس کی وجہ یہی ہے کہ مسائل کو دو مختلف نام دیئے گئے ہیں۔ نظم وضبط کے مسائل کے بارے میں لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ سکول سے متعلق معاملہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت کم لوگ اس میں اپنی کوئی ذمہ داری محسوس کرتے ہیں۔ لیکن جب یہی معاملہ زیادہ بڑھ جاتا ہے تو بہت بڑا مسئلہ بن جاتا ہے جس سے ہر کوئی متاثر ہوتا ہے۔

سکول کے مسائل کو معاشرے کے مسائل سمجھا جانے لگے تو اس سلسلے میں سامنے آنے والا عوامی ردعمل یقیناً مختلف ہو جائے گا۔ یہی ردعمل جمہوری روایات کو بھی پروان چڑھا سکتا ہے۔ اسی کے ذریعے سکول اور عوام کی جانب سے کئے جانے والے کاموں میں بہتر مطابقت پیدا ہوسکتی ہے۔ دونوں طرف بہتر تعاون کی فضا پیدا ہوسکتی ہے۔ رابرٹ پٹنام کی ریسرچ میں بھی تعلیمی سرگرمیوں اور سماجی سرگرمیوں میں باہمی تعلق ثابت ہوا۔ یہ تحقیق واضح طور پر یہی کہتی ہے کہ سکول میں سامنے آنے والی کارکردگی پر معاشرتی کام اثر انداز ہوتا ہے۔ تاہم میں اس ضمن میں جمہوری روایات کا بھی اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔

کام میں مطابقت پیدا کرنے کی راہ میں حائل رکاوٹوں پر قابو پانا

تمام تر فوائد کے باوجود سکولوں اور معاشرے کے مابین بہتر تعلق قائم کرنے کی راہ میں کئی رکاوٹیں ہیں۔ سکول والوں کی نظر سے دیکھا جائے تو عوام کی جانب سے استعمال میں لائے جانے والے تمام تر وسائل ان کے پیشہ ورانہ وسائل سے مکمل طور پر مختلف ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ سماجی طور پر علم پھیلانے کے عمل اور سکول کے باقاعدہ کام میں مطابقت پیدا کرنا بھی ایک مشکل کام ہے۔ سماجی تعلیم کے ذریعے بچے جو کچھ سیکھتے وہ ہر وقت کلاس روم میں کئے جانے والے کام جیسا نہیں ہوتا۔ ایک رکاوٹ یہ بھی ہے کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ تعلیم دینے کیلئے پیشہ ورانہ تعلیم کا ہونا ضروری ہوتا ہے جو عام شہریوں کے پاس نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ معاشرے کو وسائل کے مرکز کے بجائے ایک ذمہ داری سمجھا جاتا ہے۔ ایک پچیس سالہ استاد نے اسی بارے میں کچھ ایسا کہا تھا کہ 'مجھے کلاس روم میں پیش آنے والی مشکلات کا مقابلہ کرنا سکھایا گیا ہے نہ کہ لوگوں کے ساتھ مل کر کام کرنا'

تاہم کلاس روم اور سماجی تعلیم کے درمیان بہتر تعلق قائم کرنے کیلئے کئی تجربات ضرور کئے گئے ہیں۔ اس

ضمن میں کینٹکی کی وہ مثال بھی پیش کی جاسکتی ہے جہاں شام کے اوقات میں متبادل سکول کا انتظام کیا گیا تھا۔ لنگزنٹن کے علاقے میں ہر کوئی گھڑ سواری کو پسند کرتا ہے۔ وہاں کے لوگوں نے دیکھا کہ ساری زندگی ریس جیتنے کے بعد آخری عمر میں گھوڑوں کو فیکٹری میں کام کیلئے بھیج دیا جاتا تھا۔ لہذا ان لوگوں نے ریس جیتنے والے کچھ گھوڑے خرید لئے اور ایک فارم جس کا نام 'اولڈ فرینڈز' رکھا گیا تھا، میں ان کی رہائش کا انتظام کیا گیا۔ اس کے بعد سماجی سکول میں پڑھنے والے بچوں کو فارم پر کام کرنے کیلئے بھیجا جانے لگا۔ اس کے ساتھ انہیں زوالوجی کی مختصر تعلیم بھی دی جانے لگی۔ یوں جو چیزیں بچے کلاس روم میں نہیں سیکھ رہے تھے وہ انہیں سماجی تعلیم میں پڑھائے جانے لگی۔ اس سے اساتذہ کی براہ راست مدد ہونے لگی۔

سماجی تعلیم کیلئے صرف ہارس فارم ہی مددگار ثابت نہیں ہوئے۔ اس عمل کیلئے کئی دوسری جگہیں بھی معاون ثابت ہوئی ہیں۔ چٹانوگا میں ایک سماجی گروپ نے ایسے کئی مقامات کی نشاندہی کی ہے جو بچوں کو معلومات فراہم کرنے کا ذریعہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ انہوں نے اس ضمن میں ایک نقشہ بھی تیار کیا جس میں سکولوں کو بھی شامل کیا گیا۔

معاشرے کو بطور تعلیمی ادارہ دیکھنا

سکولوں اور عوام کے کام میں مطابقت پیدا نہ ہو سکنے کی ایک بڑی وجہ شاید یہ بھی ہے کہ ہم نے صورتحال کو ہمیشہ غلط نقطہ نظر سے ہی دیکھا ہے۔ عام خیال یہ ہے پڑھائی بنیادی طور پر سکولوں کا کام ہے اور معاشرے اس میں صرف معاونت ہی کر سکتے ہیں۔ مگر کیا ہم درست سوچتے ہیں؟ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ یہ سوچا جائے کہ معاشرے کا بنیادی کام اپنی نئی نسل کو تعلیم یافتہ بنایا ہے اور سکولوں کا کام اس میں معاونت فراہم کرنا ہے۔ اس طرح سکولوں اور عوام کے کام میں مطابقت پیدا کرنے کا مطلب کچھ یہ ہوگا کہ سکولوں میں وہی کام کروائے جائیں جس سے معاشرے میں کئے جانے والے کاموں میں مدد ملے۔

اگر تعلیم دینا معاشرے کا بنیادی کام تصور کر لیا جائے تو اس صورتحال میں معاشرے کو بھی ایک نئی نظر سے دیکھا جاسکتا ہے۔ یوں یہ بھی سوچا جاسکتا ہے کہ معاشرے صرف وہ جگہ نہیں جہاں کچھ لوگ رہتے ہیں بلکہ یہاں بہت سے ایسے کام بھی کئے جاتے ہیں جن کی بدولت اس معاشرے کے شہریوں کی زندگی بہتر ہو سکتی ہے۔ معاشروں کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ شہریوں کو اپنی صلاحیتوں کو استعمال کرنے کے بھرپور مواقع بھی فراہم کریں۔ اور اس مقصد کیلئے ضروری ہے کہ معاشرہ اپنی حیثیت میں تعلیم کے حصول کا ذریعہ بھی ہو۔

کولمبیا کے ایک کالج کے پروفیسر ایڈمنڈ گورڈن کی ریسرچ کو دیکھا جائے تو اس بحث کو مزید آگے بڑھایا جاسکتا ہے۔ انہوں نے تعلیم کے میدان میں بہتری لانے کیلئے سکولوں کی بجائے معاشرے پر توجہ دینے پر زور دیا ہے۔ سینڈی جس کا تذکرہ میں نے کتاب کی ابتداء میں کیا ہے، دراصل پروفیسر گورڈن کی دلیل پر ہی عمل کر

رہی ہیں۔معاشروں کوبطور تعلیمی ادارے دیکھنا کیسا نظر آئے گا؟اس کا ایک نقطہ نظر تو یہ ایک ہوسکتا ہے کہ معاشرے ذاتی اور اجتماعی تجربات کے ذریعے شہریوں میں علم کی روشنی بانٹتے ہیں۔اسی طرح جمہوری روایات بھی پروان چڑھتی ہیں۔عدالتیں،مقامی انتظامی مراکز اور سکول ایسے مقامات ہیں جہاں جمہوری روایات کا عملی مظاہرہ دیکھنے کو ملتا ہے۔اسی طرح کی تعلیم ٹاؤن فورمز میں بھی دی جاتی ہے۔یہ تمام جگہیں ہی فیصلہ سازی اور مل کر کام کرنا سکھاتی ہیں۔یوں صرف صورتحال دیکھنے کی بجائے شہری بطور استاد کام کرتے ہوئے باقاعدہ تجربات کے ذریعے نوجوانوں کو سکھا سکتے ہیں کہ ان خاص حالات میں کس طرح کام کرنا ہے۔اس ضمن میں سینئر سٹیزن سکول پہلے ہی کام کر رہے ہیں جہاں سماجی تعلیم دی جاتی ہے۔

لیری کریمن جنہوں نے تعلیم کی فراہمی میں امریکی معاشرے کے کام سے متعلق ریسرچ کی ہے،بھی پروفیسر گورڈن جیسے ہی دلائل دیتے ہیں۔انہوں نے امریکی شعبہ تعلیم کی تاریخ سے متعلق کام میں ایسے کئی مقامات کی نشاندہی کی جنہوں نے سکول سے ہٹ کر امریکیوں میں علم کی روشنی پھیلانے میں کردار ادا کیا۔انہوں نے بتایا کہ امریکہ میں عجائب گھروں،خاندانوں،مذہبی مقامات،نوجوانوں کے گروہوں،سماجی تنظیموں،اخبارات اور فوجی اداروں کی جانب سے تعلیم پھیلائی جاتی رہی ہے۔

اس تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو یہ سوال کہنا بے جا نہ ہوگا کہ کیوں کر معاشرے ان تمام تر جگہوں کی موجودگی میں تعلیم پھیلانے کیلئے سکولوں کے ساتھ مل کر کام نہیں کرتے؟ کچھ سکولوں کی طرف سے تو بچوں کو عجائب گھروں کے دورے کروائے جاتے ہیں۔اسی طرح کچھ مڈل کلاس خاندانوں کی جانب سے سکول کے بعد کے اوقات میں بچوں کو سماجی تعلیم دینے کا انتظام بھی کیا جاتا ہے۔لیکن ایسی مثالیں بہت ہی کم ہیں جبکہ اس طرح کے اداروں کے ذریعے تعلیم پھیلانے کے مواقعے تو ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں۔

اسی طرح کریمن نے سکولوں کی انتظامیہ مقرر کرتے ہوئے بھی تعلیمی مقاصد کو مدنظر رکھنے پر زور دیا ہے۔اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ عجائب گھروں اور ایسے دوسرے اداروں کو سکولوں کے کنٹرول میں دے دیا جائے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے معاشرے کے لوگ سکولوں کی بجائے تعلیم پر توجہ دینا شروع کریں۔

اس کے بعد ایسے امکانات موجود ہیں کہ ایسے تمام تر اداروں میں باہمی رابطہ قائم کر کے ایک بہترین نیٹ ورک قائم کیا جا سکے۔ایسے کسی نیٹ ورک کی موجودگی میں ہی بہترین نظام تعلیم کا جامع منصوبہ حقیقت کا روپ دھار سکتا ہے۔بالکل اسی طرح معاشی ذرائع کی تلاش کیلئے مختلف طریقہ کار اپنائے جاتے ہیں۔تاہم اس امکان کے سودمند ہونے کی کتنی گنجائش ہے یہ دیکھنا ابھی باقی ہے۔

یہ بھی ایک اہم سوال ہے کہ کیا موجودہ تعلیمی بحران کی واحد وجہ ان تمام وسائل کے درمیان رابطے کا

فقدان ہی ہے؟ اور یہ بھی کہ کیا ان کے مابین بہتر تعلق قائم کرنے کا نیا ادارہ قائم کر کے تمام مسائل پر قابو نہیں پایا جا سکتا؟ میرا خیال ہے نہیں۔ شاید ان تمام اداروں کو ایک خاص تعلیمی ماحول پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک سیکھنے والا معاشرہ ترتیب دینے کی ضرورت ہے۔ تحقیق میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ سکولوں کے حالات بہتر کرنے کی بجائے ایسا ماحول پیدا کرنا زیادہ سودمند ثابت ہو سکتا ہے۔

سیکھنے کے رجحان کو فروغ دینا

سکولوں اور عوام کے کاموں میں مطابقت پیدا کرنے کے عمل کی راہ میں کئی رکاوٹیں پیش آ سکتی ہیں مگر کسی معاشرے میں سیکھنے کا رجحان پیدا ہو جائے تو وہاں ان مشکلات میں کمی آ سکتی ہے۔ کمیونیٹیز سماجی رویوں اور اقدار کے ذریعے سب سے زیادہ سیکھتی ہیں۔ اسی کی وجہ سے کسی معاشرے میں علم و عمل کی قدر و منزلت کا تعین ہوتا ہے۔ ایسے ہی معاشروں میں علم کو اہمیت دی جاتی ہے اور اس کے حصول کیلئے کوشش کی جاتی ہے۔ کسی معاشرے میں سیکھنے کا رجحان ہی وہاں کے عوام کی جانب سے آپس میں مل جل کر کئے جانے والے کاموں میں بھی نظر آتا ہے۔ اس کو سمجھنے کیلئے یہ مثال پیش کی جا سکتی ہے۔ ایک علاقے میں تمام ہی لوگ نئی نسل کو پڑھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس ضمن میں ہر کوئی کردار ادا کر رہا تھا۔ کاروباری طبقہ نوجوانوں کو تربیتی نوکریاں دے رہا تھا تو گرجا گھروں میں خصوصی کورسز کا اہتمام کیا جا رہا تھا۔ اس کے علاوہ کھیلوں میں بھی نوجوانوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ تمام لوگ یہ کردار ادا کر رہے تھے کیونکہ معاشرہ ان سے اس کی توقع کرتا تھا۔ یوں معاشرے میں لوگ سب سے اہمیت سیکھنے کے عمل کو ہی دیتے تھے اور اس ضمن میں اپنی ذمہ داری بھی محسوس کرتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو کچھ بھی کیا جا رہا تھا وہ شاید اہمیت کا حامل نہیں تھا مگر اس معاشرے میں کوشش کرتے رہنے کا ایک خاص رجحان ضرور پایا جاتا تھا۔

ریاست منیسوٹا کے علاقے سینٹ پال میں بھی اس طرح کا غیر معمولی کلچر فروغ پا رہا تھا۔ وہاں کے لوگ مقامی تاریخ کے بارے میں تعلیم دینے کیلئے مقامی وسائل کو بروئے کار لاتے تھے۔ میری بوئینڈ جو کہ اس سارے کام میں آگے آگے تھے، یہ سمجھتے تھے کہ ثقافتی علم اور پہچان کے سبب نوجوانوں میں اعتماد پیدا ہوتا ہے اور اس کے نتیجے میں وہ مثبت سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ اسی طرح سینٹ لوئس پارک کے علاقے، البیون اور مشی گن میں بھی کئی سماجی کوششیں جاری تھیں۔ اس تمام کوششوں کا مقصد مقامی تنظیموں کیلئے ایک مثال قائم کرنا تھا کہ کس طرح عام لوگ بھی تعلیمی خدمات سرانجام دے سکتے ہیں۔ سینٹ لوئس پارک کے لوگوں نے پہلے بچوں کیلئے چرچ کے زیر انتظام ایک سکول قائم کیا۔ دوسری جانب البیون کے لوگوں نے ایک ایسی فہرست تیار کی جس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ کس طرح کون کون نوجوانوں کیلئے مثبت اقدامات کر سکتا ہے۔ اس میں روایتی تعلیم دینے اور کام کاج سکھانے جیسے کام شامل تھے۔ یوں انہوں نے معاشرے میں ایک نیا رجحان ترتیب دینے کیلئے جو کوشش

کیں وہ قابل تحسین تھیں۔

لیکن یہ کیسے معلوم ہوگا کہ کسی معاشرے میں سیکھنے کا رجحان پایا جاتا ہے کہ نہیں؟ یقیناً ایسے معاشرے میں سکول، کالج، ہوٹل، گرجا گھر اور سماجی تنظیمیں، غرض ہر ادارہ نوجوانوں کو ہنر سکھانے اور ان کی تربیت کرنے میں مصروف ہوگا۔

شاید یہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ کسی معاشرے میں سیکھنے کے رجحان کو فروغ دینے کیلئے وہاں کے سکول یا ان کی انتظامیہ مرکزی کردار ادا کر رہے ہوتے ہوں گے۔ لیکن افسوس کی بات ہے کہ ایسا حقیقت میں نہیں ہوتا۔ سکول کی انتظامیہ کلاس روم کی حد تک تو مرکزی کردار ادا کرتی ہے مگر یہ کلاس روم میں جا کر معاشرے کے نمائندوں کا کردار ادا نہیں کرسکتی۔ شاید ایسا ہونا بھی سکول کی انتظامیہ کی ہی ناکامی ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر سکول معاشرے میں کچھ زیادہ کردار ادا کرنے لگیں تو انہیں بے شمار رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ انہیں کئی قسم کے قوانین کی پابندی کرنا ہوتی ہے۔ اور پھر ان کی اور بھی بہت ساری ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ اور شاید کئی دوسرے ادارے بھی انہیں ایسا کرنے کی اجازت نہ دیں۔ یہی وجہ ہے کہ معاشرے میں ہونے والے کام اور سکولوں کے کام میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کہیں اور سے ہونی چاہئے۔ ہاں لیکن اس طاقت کو سکول انتظامیہ حمایت ضرور حاصل ہونی چاہئے۔

غیر سرکاری تنظیموں کے پاس موجود مواقع

عوامی منصوبوں اور غیر سرکاری تنظیموں کے کام میں مطابقت پیدا کرنا قدرے آسان کام ہونا چاہئے۔ کیونکہ یہ تنظیمیں بھی سماجی کام میں ہی مصروف ہوتی ہیں۔ این جی اوز مکمل طور پر غیر منافع بخش ادارے ہوتے ہیں جنہیں مختلف گروہوں کی جانب سے مالی امداد فراہم کی جاتی ہے۔ یہ تنظیمیں ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں اور ان کے کام کے بارے میں کئے جانے والے تجربات کے نتائج تمام این جی اوز کیلئے قابل عمل نہیں ہو سکتے۔ این جی اوز کو بھی عوامی عدم اعتماد کا سامنا تو ہے مگر یہ کسی حد تک عوامی حمایت یافتہ ادارے ہیں اور کسی حد تک ان کا استحقاق ابھی بھی موجود ہے۔ تاہم بیک وقت لوگوں کی بڑی تعداد سرکاری اداروں اور این جی اوز پر یکساں قسم کا اظہار عدم اعتماد کرتی ہے۔ انہیں بھی دوسرے اداروں کی طرح ہی سمجھا جاتا ہے کیونکہ این جی اوز کے ایجنٹس اور ان کے عوامی رابطے کے عمل کی اپنی کئی مشکلات ہیں۔

این جی اوز کے سرکاری اداروں کے زیر اثر چلے جانے اور ان میں ماہرین کی بڑھتی ہوئی تعداد کی وجہ سے کافی حد تک ان سماجی تنظیموں پر بھی اعتماد کرنے والوں کی تعداد میں کمی ہوتی جا رہی ہے۔ ان میں سے کئی اداروں پر تو باقاعدہ حکومتی تسلط قائم ہو چکا ہے اور یوں ان کا زیادہ تعلق بیوروکریسی سے ہے نہ کہ جمہوری روایات سے۔ ان اداروں کیلئے ضروری ہے کہ وہ اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کریں کیونکہ ان کو ملنے والی امداد ٹیکس کی رقوم پر ہی

مشتمل ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مالی امداد کرنے والے اداروں نے این جی اوز کے کام کی افادیت کا جائزہ لینے کیلئے شماریاتی جائزہ لینا شروع کر دیا ہے۔

لیکن نتائج دکھانے کیلئے ڈالا جانے والا یہ دباؤ ان اداروں کے لئے مضر بھی ثابت ہوسکتا ہے۔ کیونکہ ان کی جانب سے کئے جانے والے کام سست اور ان کے نتائج عموماً غیر مادی قسم کے ہوتے ہیں جن کی پیمائش ہی نہیں کی جاسکتی۔ بروس سیورز جو کہ ایک تجربہ کار فلسفہ دان ہیں، کہتے ہیں کہ یہ بات جھوٹ ہے کہ سیاسی کنٹرول اور موثر سماجی کام کیلئے کوئی پیشہ ورانہ علم سود مند ثابت ہوسکتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ عملی کام کی زیادہ حوصلہ افزائی کی جانی چاہئے۔ ایسی حوصلہ افزائی کی بدولت ان منصوبوں اور عوامی کوششوں میں بہتر مطابقت پیدا کرنے کے مواقع میسر آسکتے ہیں۔

انتہائی چھوٹے منصوبے سے آغاز کرنا

قابل پیمائش پیمانوں کے ذریعے کارکردگی جانچنے کے عمل کی حوصلہ شکنی کے بعد کچھ تنظیمیں کئی دوسرے طریقہ کاروں کی جانب راغب ہو رہے ہیں۔ ایسے طریقہ کار جن میں شہریوں کے کام کی معاونت کرنے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے اور جو شہریوں کے چھوٹے چھوٹے کام میں ان کی مدد کرتے ہیں اور اس کام کو اس کے بعد بھی چھوٹی سطح تک ہی محدود رکھا جاتا ہے۔

ایسی غیر سرکاری تنظیمیں ایک خاص علاقے سے تعلق رکھتی ہیں جن کا خیال ہوتا ہے کہ ان کے منصوبے شہریوں کو ان کی زندگی کا کنٹرول اپنے ہاتھوں میں لینے میں معاون ثابت ہوں گے۔ بہت ساری تنظیمیں تو صرف شہریوں کے آپس میں مل جل کر کام اور معاشرے کو مضبوط کرنے کا عمل کس طرح جاری رکھتے ہیں۔ اس میں مالی امداد دینے والے ادارے صرف پیسہ دینے کے علاوہ بھی کئی کام کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ کام قریبی علاقوں میں کام کرنے والی کچھ مقامی تنظیموں کے مابین رابطہ قائم کرنے کی صورت میں کیا جاسکتا ہے۔ تاکہ یہ ادارے باہمی تعاون سے آگے بڑھ سکیں۔

دوسرے شعبہ جات میں کئے جانے والے تجربات کے ذریعے بھی این جی اوز کے کام میں مطابقت پیدا کی جاسکتی ہے۔ مثال کے طور پر تنظیموں کو معاونین کے شعبہ جات سے کچھ ایسے لوگ میسر آسکتے ہیں جو معاشرے میں استعداد کار کے اضافے کیلئے کام کرنا چاہتے ہوں۔ یوں ان میں کئی قدریں مشترک ہوسکتی ہیں۔ خصوصاً ایسے سرکاری اداروں میں کام کرنے والے افراد جو عوام پر مشتمل سماجی تنظیموں کے ساتھ کام کرنے کو ترجیح دیتے ہوں۔ ایسے سرکاری ادارے عام طور پر این جی اوز کی نگرانی کے کام کے علاوہ ان کو بہتر کرنے کیلئے بھی کام کر رہے ہوتے ہیں۔ ویسٹ ورجینیا میں امریکی دفتر داخلہ نے ایک ایسے علاقے کے رضا کاروں کے ساتھ مل کر ماحول کو صاف کرنے کا معاہدہ کیا جہاں سے کوئلہ نکالا جاتا ہے۔ اس دوران یہ بات سامنے آئی کہ جب پیشہ ور لوگ عام لوگوں

کے ساتھ مل کر کام کرتے ہیں تو انہیں عمومی طریقہ کار سے پڑتا ہے۔ ایسی تکنیک استعمال کی جاتی ہے عام لوگ استعمال کرتے ہیں۔ اس کی وجہ سے ان اداروں میں کام کرنے والے افراد اور عوام میں بہتر مطابقت پیدا کی جاسکتی ہے۔ سرکاری معمول میں جمہوری روایات کا رنگ چڑھانے کا موقع میسر آتا ہے۔ ایسا کچھ عملی طور پر دیکھنے کیلئے باقاعدہ تجربات کی ضرورت ہے مگر یہ بات ایک حقیقت ہے کہ اس کی پوری گنجائش موجود ہے۔

این جی اوز میں مطابقت پیدا کرنے کے تجربات کے بارے میں 1990 کی دہائی میں جاری رہنے والے منصوبے 'سول انویسٹنگ' سے بہت کچھ سیکھا جاسکتا ہے۔ یہ منصوبہ شروع کئے جانے کی وجہ یہ تاثر تھا کہ منصوبوں کیلئے اداروں کی جانب سے دیئے جانے والے فنڈز ہی کافی نہیں ہیں۔ ایسا مالی معاملات کی خرابی کے سبب نہیں تھا بلکہ یہ کہا جاتا تھا کہ منصوبوں کی تکمیل کیلئے شہریوں کی جانب سے خاص استعداد کار کا مظاہرہ بھی ہونا چاہئے۔ اس سے یہ سبق حاصل کیا جاسکتا ہے کہ سب سے زیادہ پیشہ تو لوگوں کی معاشرت پر خرچ کیا جانا چاہئے جس سے معاشرے تشکیل پاتے ہیں۔

معاشرے کی تعمیر ابھی بھی کچھ اداروں کا مقصد ہے۔ انہیں اس پر کام کے دوران وہ چیزیں سیکھنے کو ملتی ہیں جن کی بدولت معاشرے چلتے ہیں۔ ان حقائق کی وجہ سے جمہوری اقدار فروغ پاسکتی ہیں۔ اداروں کے معمول کو بھی مسائل کا سامنا کرنا پڑسکتا ہے۔ جس کی بدولت ایسا نظام قائم ہوسکتا ہے جس کا مرکز شہری ہوں۔ یہ استعداد کی نشاندہی ان اداروں میں اٹھائے جانے والے اس سوال کے جواب میں بھی کی جاسکتی ہے کہ جمہوریت سے آخر ان کی مراد کیا ہے؟ اس سوال کا ایک جواب حق خود اداریت ہوسکتا ہے۔ جمہوریت کی اس تعریف کو ذہن میں رکھ کر معاشرتی تعمیر کیلئے کام کرنے والی تنظیموں کی مالی امداد پر فیصلہ سازی کے عمل کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں بیشتر کسی مسئلے کی نشاندہی کرتی ہیں، پھر اس کو کوئی خاص نام دے کر اس کے حل کیلئے پیشہ ورانہ رائے لی جاتی ہے۔ اس رائے کی بنیاد پر مالی امداد دینے کے بارے میں فیصلہ کیا جاتا ہے۔ اسی کی بنیاد پر منصوبے کے ممکنہ نتائج پر بھی غور کیا جاتا ہے۔ اس موقع پر کوئی یہ سوال اٹھا سکتا ہے کہ اس طرح حق خودارادیت کیلئے کام کیسے سرانجام دیا جا رہا ہے؟ یہ سوال اٹھانا ہی بہتری کا باعث نہیں بن سکتا جب تک کہ بہتری کی جانب باقاعدہ قدم نہ اٹھایا جائے۔

میرا خیال ہے کہ منصوبوں میں بہتر مطابقت پیدا کرنے کیلئے نہ صرف مالی امداد بلکہ مالی امداد دینے والے افراد کے معمول کو بھی دیکھا جانا ضروری ہے۔ اس کی وجہ سے اداروں کے بنائے گئے کئی ضابطوں پر بھی اثر پڑے گا۔ ایک ایسی تنظیم جو فلاحی منصوبوں کیلئے اربوں ڈالر کی امداد دیتی ہے، کے اہلکار نے بتایا کہ منصوبوں میں مطابقت پیدا کرنے کی راہ میں سب بڑی رکاوٹ مالی امداد دینے والوں اور لینے والوں کے درمیان پایا جانے والا تعلق بھی ہے۔ اگر تو یہ تعلق اس مفروضے پر قائم ہے کہ این جی اوز معاشرے میں جمہوری اقدار کے فروغ کیلئے کوشاں ہیں تو یہ مفروضہ ایک آسان طریقہ کار پر منتہا ہوسکتا ہے۔ اس کے علاوہ مالی امداد دینے والا خود کو اعلیٰ اخلاقی

مرتبے پر فائز تصور کرتا ہے۔ کیونکہ وہ عام شہریوں کی بہتری کیلئے کام کر رہا ہوتا ہے۔لیکن درحقیقت تو مالی امداد دینے والے یہ لوگ براہ راست عوام کیلئے کوئی کام نہیں کر رہے ہوتے۔

این جی اوز کو معاشروں کے ساتھ تعلقات بہتر کرنے پر کئی ثمرات بھی ملتے ہیں۔لیکن ان کے کام کی وجہ سے معاشرے کی استعداد کار میں اضافے کی بجائے ان پر انحصار کرنے کی عادت پیدا ہو جاتی ہے۔جس میں کوئی مالی امداد دینے والا ادارہ سب کیلئے مفید ثابت ہو رہا ہوتا ہے۔ یوں سماجی کام کرنے والے ادارے بھی وہی منصوبے شروع کرنے لگتے ہیں جو مالی امداد دینے والی فرمائش ہوتے ہیں۔ یوں معاشرے کی استعداد کار بڑھانے کا عمل کسی حد تک مالی امداد دینے والوں کے ہی قابو میں ہوتا ہے۔اس صورتحال میں مالی امداد لینے والے لوگ بھی اپنا مستقبل خود تشکیل دینے کی بجائے مالی امداد لینے کی طرف ہی زیادہ دھیان دیتے ہیں۔

حکومت کیلئے موجود مواقع

’جمہوری معاشرے میں آزادی اور برابری اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب تمام افراد حکومت میں برابر کے حصہ دار ہوتے ہیں‘۔۔۔ارسطو

غیر سرکاری اداروں اور سرکاری اداروں میں مسائل کو دیکھا جائے تو دونوں جانب یکساں صورتحال ہے۔عوام کی جانب سے منتخب حکومت اور سرکاری اداروں پر عدم اعتماد کی شرح میں بھی مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جمہوری اقدار کے فروغ سے عوام اور حکومت کے مابین تعلقات بہتر ہو سکتے ہیں۔ اسی کے ذریعے جمہوریت یا از خود حکمرانی کا نظام بھی مضبوط ہوتا ہے۔اور عوامی منصوبوں کے ساتھ مطابقت پیدا ہونے کی صورت میں یہ منصوبے بذات خود حکومت کیلئے بھی مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔

’عوام اور حکومت کے درمیان پایا جانے والا خلا حکومت اور معاشرے کیلئے کسی بھی بیرونی خطرے سے زیادہ خطرناک ہے‘۔۔۔ہوبارٹ ہیمفرے

قانون ساز ادارے

قانون ساز اداروں کے مابین تعلق شاید قومی اسمبلیوں اور مقامی انتظامی اسمبلیوں کے درمیان پائی جانے والی مطابقت کی صورت میں ہو سکتا ہے۔ایسے کئی تجربات کئے جا چکے ہیں جن میں کوشش کی گئی کہ عوام کی جانب سے شروع کئے جانے والے منصوبے قانون سازی کے عمل کو متاثر کریں تا کہ عوام اور ان اداروں میں بہتر

تعلق قائم کیا جا سکے۔ یہی کام مخصوص مفاد پرست ٹولے بھی کرتے ہیں مگران کے مقاصد کچھ مختلف ہوتے ہیں۔ جبکہ اس مطابقت کا مقصد تو عوامی استعداد کار میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس طرح کی کوشش سے اداروں میں بیٹھے لوگوں کو معلوم ہوسکتا ہے کہ شہریوں کو کس طرح اپنے کاموں میں شامل کرنا ہے۔ تاکہ سیاسی عمل کے جمود کو دور کیا جا سکے اور معاشرتی تقسیم کو ختم کیا جا سکے۔ قانون ساز اداروں کو عوامی منصوبوں سے انتخابی عمل میں تو شاید کوئی مدد نہیں مل سکتی مگرانہیں پالیسی سازی میں ضرور رہنمائی میسر آسکتی ہے۔ عوامی نمائندوں کی ہاں یا ناں جاننے سے پہلے عوامی سوچ کا اندازلگالیا جائے تو یہ بہتر امر ہوسکتا ہے۔

سال 2008 میں عوامی مباحثوں میں یہ بات سامنے آئی کہ عوام نے ابھی تک صحت عامہ کے میدان میں بڑھتی ہوئی قیمتوں کے پیچھے کیا عناصر کارفرما ہیں۔ اس ضمن میں پالیسی آپشنز کے بارے میں بھی عوام کو کوئی خاص علم نہیں تھا۔ اس عمل میں لوگوں کو زیادہ شامل کرنے سے معاشرے میں گروہ بندی ہوجانے کا خدشہ تھا۔ کیونکہ ان وجوہات کا احاطہ کرنے کیلئے اور ممکنہ پالیسیوں کے مابین پائی جانے والی چپقلش کے مواقعوں پر مناسب کام نہیں کیا گیا تھا۔ تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان معاملات پر مباحثے کی وجہ سے معاشرے میں پیدا ہونے والی تقسیم پر قابو پایا جاسکتا تھا؟ اس سوال کا جواب صاف نہیں کی صورت میں آسکتا ہے۔ لیکن بہرحال عوام میں پائی جانے والی کشیدگی کو کم کرنے کی گنجائش ضرور موجود تھی۔

سرکاری اداروں اور عوامی تنظیموں کے درمیان مطابقت پیدا کرنے کے تجربات کا سب سے بڑا مقصد یہ جانچنا ہوسکتا ہے کہ کیا یہ ادارے عوام کے ساتھ مل کر بڑے معاملات پر پالیسی سازی کر سکتے ہیں؟ خاص طور پر ایسے معاملات جن پر عوام میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ وفاقی قرضہ جات میں کمی کا معاملہ۔ سال 2013 میں کانگرس کے سابق اراکین اور شعبہ مالیات کے سابق ملازمین نے اس بات پر غور کیا کہ کیا مالی خسارے میں کمی کے معاملے پر عوامی مباحثے کے انعقاد کا طریقہ کار وضع کیا جا سکتا ہے؟ اس بحث کا مرکز افسران کے خدشات ہوسکتے تھے۔ جن میں ان کا خیال تھا کہ عوام یہ بات نہیں سمجھ سکتے۔ دوسرا امر یہ تھا کہ عوام آپس میں پائی جانے والی چپقلش پر کیسا ردعمل دیں گے؟ پھر اس بات چیت میں یہ بھی بتایا جانا تھا کہ عوام کی کونسی عزیز چیزیں اس وقت خطرے سے دوچار تھیں۔ اور آخر میں یہ بتانا بھی ضروری تھا کہ عوام اس معاملے میں کیا کردار ادا کرکے شامل ہوسکتے تھے۔ اس ساری صورتحال کا جائزہ لینے کیلئے ایک ہی میٹنگ کافی نہ تھی۔ یہ عمل تو شاید آئندہ بارہ مہینوں تک بھی جاری ہی رہے گا۔ اور تب تک یہ کتاب چھپنے کے عمل میں ہوگی۔ لیکن یہ ایک حقیقی امر ہے کہ اگر اس قدر لمبے عرصے تک بنیادی معاملات پر مباحثہ جاری رہے تو عوام اور اداروں میں مطابقت پیدا ہونے کے قوی امکانات موجود ہیں۔

انتظامیہ

قانون ساز اداروں کے علاوہ عوام کے عدم اعتماد کا سب سے بڑا نشانہ براہ راست انتظامی ادارے ہیں۔ان اداروں کو بیوروکریسی بھی کہا جاسکتا ہے۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اگر قانون ساز اداروں کے ساتھ مطابقت پیدا ہو جائے تو عوام اور انتظامیہ کے درمیان تعلقات بھی بہتر ہو سکتے ہیں۔اس ضمن میں کئے جانے والے تجربات میں سے بطور مثال وہ آن لائن عوامی مباحثاتی گیمز ہیں جن سے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ عوام مالی لحاظ کونسی چیزوں کو اہمیت دیتے ہیں اور وہ ممکنہ مالی چپقلش سے کس طرح نمٹیں گے۔

مطابقت کو جانچنے کیلئے ایسے تجربات بھی کئے جاسکتے ہیں جن میں یہ دیکھا جائے کہ سماجی کام کے ذریعے اداروں کے کام کو مزید موثر بنایا جاسکتا ہے۔عوام کی جانب سے اداروں کے کام کے متبادل کے طور پر چلائے جانے والے منصوبے مطابقت پیدا کرنے میں سودمند ثابت ہو سکتے ہیں۔لیکن میرا خیال ہے کہ اس سب کے باوجود بھی ماہرین کے ذہن میں عوام کے حوالے سے پائے جانے والے خدشات اپنی جگہ موجود رہیں گے۔لیکن یہ تبدیلی لانا یقیناً ناممکنات میں سے نہیں ہے۔

عوامی منصوبوں کی بدولت نہ صرف بیوروکریسی بلکہ مقامی سکولوں اور اعلیٰ سماجی اداروں کی بھی معاونت ہوتی ہے۔لیکن اس دوران میں اس بات پر ایک بار پھر زور دینا چاہتا ہوں کہ عوام اپنے مستقبل پر زیادہ سے زیادہ قابو پانا چاہتے ہیں۔ اور جمہوری نظام کے نتیجے میں زیادہ سے زیادہ ذمہ داریاں عوام کے ہاتھ میں دینے کی ضرورت ہے۔شہریوں کے ساتھ کی جانے والی شراکت داری یہ مقصد حاصل ہو سکے یا نہیں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

عوام کی جانب سے اکثر اوقات سرکاری کاموں میں بطور رضا کار خدمات پیش کی جاتی ہیں۔ اس دوران ادارے یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ کیا کام کیا جائے گا اور عوام اس کام کو کرنے میں ان کے ساتھ شراکت داری کرتے ہیں ۔مثال کے طور پر کسی سکول کی عمارت بنانے والے انجینئرز کی معانت کیلئے عام لوگ سامنے آسکتے ہیں۔اس سکول کو ان کا مشترکہ منصوبہ کہا جاسکتا ہے۔اس کے علاوہ یہ بھی ممکن ہے کہ ماہرین اور عوام الگ الگ کام کریں مگر ان کا کام ایک دوسرے کے کام کی معانت کر رہا ہو۔اس باہمی مطابقت کی وجہ سے دونوں کام ایک دوسرے کی تکمیل کا باعث بن سکتے ہیں۔مثال کے طور پر انجینئرز سکول کا نقشہ تیار کریں اور عوام بیلچوں کے ساتھ سامنے کی ترسیل میں مدد کریں۔اس طرح کے منصوبوں میں جمہوری روایات کی ترویج کے مواقع موجود ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان سے عوام کو آزادانہ طور پر کام کرنے کا موقع ملتا ہے۔ وہ اپنے کام کیلئے ذمہ داری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

'ایلینز اوسٹرم جن کا تذکرہ پہلے بھی کیا جا چکا ہے، نے ایسے کئی کاموں کی نشاندہی کی جن سے عوام اداروں کی معاونت کر سکتے ہیں۔ اس میں عوامی منصوبے سرکاری منصوبوں کیلئے بطور متبادل کام کرتے ہیں۔ ایسے متبادل منصوبوں کی اہمیت کو جانچنے کیلئے کسی قدرتی آفت کی صورتحال کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ آفات کے بعد پہلے 72 گھنٹوں تک کئے جانے والی امدادی سرگرمیوں میں عوام کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ سڑکوں کی بندش کے دوران سرکاری اور انتظامی ادارے متاثرہ علاقوں میں فوراً نہیں پہنچ پاتے۔ یوں عوام کو اس مشکل کی گھڑی میں ایک دوسرے پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ ہمسائیوں کے بہتر باہمی تعلقات مالی معاملات کے حل اور اعلیٰ ادویات کی تیاری سے کہیں زیادہ ضروری ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ سکیورٹی ایک اجتماعی مسئلہ ہے۔ جس کیلئے سب مل کر کام کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میرا خیال ہے کہ ایسے منصوبوں کی وجہ سے اس طرح کے کئی مزید تجربات کرنے اور اداروں کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کی واضح گنجائش پیدا ہوتی ہے۔'

عدلیہ

کم ہوتے ہوئے عوامی اعتماد سے عدلیہ جیسے ادارے بھی متاثر ہوئے ہیں۔ امریکی سمجھتے ہیں کہ ان کے پاس دنیا کا بہترین عدالتی نظام ہے۔ اس کے باوجود عوام کی اکثریت اس نظام میں کئی اصلاحات متعارف کروائے جانے کی خواہاں ہے۔ اس ضمن میں کئے جانے والے تمام تر تجربات کا انحصار اس سوال کے جواب پر ہے کہ عدالتی افسران عوامی درعمل کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟ یہ جاننے کیلئے امریکن بار ایسوی ایشن نے تین مباحثاتی ہدایات جاری کر رکھی ہیں۔ ان ہدایات کی روشنی میں عوامی مباحثوں کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ امریکیوں کو عدالتی نظام میں پیسے کے اثر ورسوخ پر تحفظات ہیں۔ عوام کا یہ بھی خیال ہے کہ جج صاحبان تمام ہی مقدمات کو اپنے معمول کی طرح سمجھتے ہیں۔ وہ اس عمل کے دوران بوریت کے شکار اور تھکے ہوئے نظر آتے ہیں۔

یہ عوامی ردعمل جائز ہو یا ناجائز مگر یہ اس بات کی نشاندہی ضرور کرتا ہے کہ اس ضمن میں کئے جانے والے تجربات میں کن عوامل کا مشاہدہ کیا جانا ضروری ہے۔ عدالتوں اور عوام میں بہتر مطابقت کی صورت میں کیا نتائج نکلیں گے یا اس ضمن میں کیا توقعات رکھنی چاہئیں؟ اس سوال کا جواب تا حال معلوم نہیں ہو سکا۔ ابھی تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ عدالتی نظام اور عوام کے درمیان تعاون کی عملی مثال 'جیوری' کے نظام کی صورت میں موجود ہے۔ یہ ایک مثبت قدم ہے۔ لیکن آج کل ایسی خبریں بھی آ رہی ہیں کہ جیوری کو بھیجے جانے والے کیسوں کی تعداد کم کر دی گئی ہے۔ لیکن اس کے باوجود عوام اور عدالتوں کے درمیان بہتر مطابقت دوسرے اداروں کیلئے ایک اعلیٰ مثال ہے۔

شروع کہاں سے کیا جائے؟

ایک روایتی سوچ یہ ہے کہ بڑھتے ہوئے عوامی عدم اعتماد کا تدارک کرنے کیلئے اداروں کو بہتر کیا جائے۔ سکولوں، سرکاری اداروں اور سماجی تنظیموں میں بامعنی اصلاحات اس ضمن میں عظیم اقدامات ہو سکتے ہیں۔لیکن اس کے باوجود صورتحال بہتر ہونے کی امید کم ہی ہے۔خاص طور پر عوام کی طرف سے محض اس وجہ سے صورتحال بہتر نہیں ہو سکتی۔اداروں کا استحقاق اور عوامی اعتماد کی فضا قائم کرنے کیلئے ضروری ہے کہ عوام کی سماجی استعداد کار میں اضافہ کیا جائے۔ یہ کام سرکاری ادارے نہیں کر سکتے۔لیکن وہ اپنے کام کو عوامی کاموں کے مطابق کر کے اس صورتحال کو بہتر ضرور کر سکتے ہیں۔

ایسے مواقع موجود ہیں۔ باب پٹنام اور ان کے بہت سارے ساتھی جن میں واہن گر ہشمن بھی شامل تھے ان کی ایک لمبی ریسرچ میں یہ بات سامنے آئی کہ عوام اس وقت حکومت سے زیادہ مطمئن ہوتے ہیں جب انہیں حکومت پر کم سے کم انحصار کرنا پڑے۔ میں ان کی تحقیق کے نتیجے میں یہ اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ خودمختار عوام کی موجودگی میں ادارے بھی مضبوط ہوتے ہیں۔ کیونکہ اس صورت میں عوام ان اداروں کے کاموں کے ساتھ کئی متبادل منصوبے جاری رکھتے ہیں جن سے اداروں کو مدد ملتی ہے۔

اداروں اور عوام کے درمیان پائے جانے والے اس تعاون کی مثال سکولوں کے ساتھ کیا جانے والا عوامی تعاون ہے۔ جہاں وہ عوام خود کو شراکت دار تصور کرتے تھے۔منصوبے میں شامل ہونے والے لوگ اپنے نوجوانوں کیلئے زیادہ سے زیادہ کردار ادا کرنا چاہتے تھے اور انہوں نے ایسا کئی طرح کے سماجی منصوبوں کے ذریعے کر دکھایا۔ان لوگوں کو یقین تھا کہ ان کے سکولوں کا کام صرف ان کے بچوں کو پڑھانا نہیں ہے بلکہ ان کا یقین تھا کہ جگہ تو سماجی تبدیلی لانے کی بھی ذمہ دار ہے۔ یوں سکولوں اور معاشرہ دونوں کو بہتر کرنے کا مقصد لوگوں کو ایک فیصلے پر لے آیا۔ یہاں تک اس میں وہ لوگ بھی شامل ہو گئے جن کے کوئی بچے ہی نہیں تھے۔ کیونکہ وہاں جو ماحول پیدا ہو چکا تھا اس کے مطابق معاشرے کی بہتری سکولوں کی بہتری کے ساتھ جڑی ہوئی تھی۔

اداروں کے پاس عوامی استعداد کار میں اضافے کیلئے ہر قدم اٹھانے کیلئے کئی ایک وجوہات ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ اس عمل میں عوام کی زیادہ دلچسپی اداروں کی بجائے معاشرے کی بہتری میں ہو۔مگر اداروں کو چاہئے کہ وہ عوام کو منصوبے شروع کرنے اور تکمیل تک لے جانے میں ان کی معاونت کریں۔عوامی استعداد کار میں اضافہ ہی معاشرتی تبدیلی کا راستہ ہے مگر اداروں میں عام سوچ یہ پائی جاتی ہے کہ یہ ان کا کام نہیں ہے۔لیکن شاید اب یہ سوچ تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔

☆☆☆☆

اختتامیہ

ڈیوڈ میتھیوز

یہ کتاب لکھنے کے بعد میں نے میرے ساتھیوں نے خود سے سوال کیا کہ ہم نے اس تجربے سے آخر کیا سیکھا ہے؟ ہم نے اس ضمن میں اپنے اپنے تاثرات دیئے جو کہ ممکن ہے آپ کے خیالات سے ملتے جلتے ہی ہوں۔ ہم اس ضمن میں آپ کی آراء سننے میں بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔

یہ کتاب دراصل پہلے سے موجود چیزوں کو ایک نئی نظر سے دیکھنے کا موقع دیتی ہے۔ یہ کتاب جمہوریت کے بارے میں پائی جانے والے عمومی تاثر سے اختلاف نہیں کرتی اور نہ انتخابی نظام کی مذمت۔ بلکہ ہمارا خیال تو یہ ہے کہ جمہوریت اس سب سے کہیں بڑھ کر ہے۔ ہم نے اس کتاب میں جمہوری نظام کو ماحولیاتی نظام سے تشبیہ دی ہے جس میں ہر کوئی اس نظام میں حصہ دار نظر آتا ہے۔

ہم نے ان وسائل کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی ہے جو عام آدمی کی طرف سے استعمال کئے جاتے ہیں۔ اس سب کو بیان کرنا بالکل بھی مشکل نہیں، مشکل تو اس غیر معمولی صلاحیتوں کے بارے میں آگہی پھیلانا ہے۔ یہ صلاحیتیں ایک مختلف سیاسی ماحول کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ ایک ایسا ماحول جس میں لوگوں کو اپنے پاس موجود وسائل کے بارے میں علم ہو اور لوگ ان چیزوں کو زندگی میں بہتری لانے کیلئے استعمال کرتے ہوں۔

اس قسم کی سیاست کی راہ میں کئی طرح کی مشکلات آتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کتاب کا ایک بڑا حصہ ناقدین کی باتوں کا تذکرہ کرنے اور ان کو مناسب جواب دینے پر صرف کیا گیا ہے۔ میں نے یہ بھی سمجھانے کی کوشش کی ہے صرف لوگ ہی اپنی حالت بہتر کر سکتے ہیں یعنی وہ ایک دن اٹھیں' کام کریں اور سب کچھ یکدم تبدیل ہو جائے۔ اس دوران **کیٹرنگ فاؤنڈیشن** نے سیکھا ہے کہ کس طرح جمہوری عمل کو آسان بنایا جا سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس ضمن میں لوگوں کو کسی خاص تربیت کی ضرورت ہے بلکہ کتاب میں ایسے معمولی معمولی کاموں کی نشاندہی کی گئی ہے جن سے صورتحال مختلف ہو سکتی ہے۔

ہم نے اکثر یہ دیکھا ہے کہ بہتری لانے والے لوگوں کا معمول کچھ مختلف ہوتا ہے۔ وہ فیصلہ سازی میں بات چیت کو ترجیح دیتے ہیں۔ یوں وہ اپنی توقع سے بھی بڑھ کر کام کرنے کی صلاحیت حاصل کر لیتے ہیں۔ وہ چھوٹے چھوٹے وسائل کو سودمند بناتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ لوگوں سے بات چیت کو بھی موثر بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

ایک طالبعلم جس کو سکول میں تربیت کے دوران مباحثے کے ذریعے فیصلہ سازی کی مشق کروائی گئی تھی